میں انتظار کروں گا

کرشن چندر

چودھری اکیڈمی لاہور

میں انتظار کروں گا

کرشن چندر

چودھری اکیڈیمی لاہور

۳۰۵۔ ذوالقرنین چیمبرز، گنپت روڈ

ناشر ——— محمد خالد چوہدری
حسن کار ——— عبدالحکیم نگینوی
اہتمام ——— روبینہ چوہدری
طابع ——— نذیر حسین
اشاعت ——— اکتوبر ۱۹۷۷ء
مطبع ——— ندرت پرنٹرز لاہور
قیمت ——— دس روپے

چوہدری اکیڈمی ——— لاہور

ترتیب

میں انتظار کروں گا

ذی ای دیکھنے میں نازک اور سبک تھی۔ اس کی خوب صورتی شاہی خاندان کی کسی پرانی چینی صراحی کی طرح تھی جو کسی امیر گھرانے کی منقش طاق میں یا اونچے اونچے آئینوں والے دریچے میں اپنی صحیح رعنائی کے لئے جگمگا رہی ہو۔ پہلے دن جب میں کاغذ کے پھول بیچنے نکلا تو مجھے وہ بالکل اسی طرح نظر آئی جس طرح میں نے ابھی بیان کیا۔ وہ اپنے بڈھے باپ ہانگ کے ساتھ کرافورڈ مارکیٹ کے تراہے پر کاغذ کے پھول، شگوفے بیلیں، گملے، شاخیں، ٹوکریاں، ٹوپیاں اور پنکھے اٹھائے کھڑی تھی۔ سردی کا موسم تھا اور اس نے نیلے رنگ کی ایک صدری پہن رکھی تھی اور نیلے رنگ کا پائجامہ اس میں بھی روئی کی تہ سلی ہوئی تھی۔ اس کے پاؤں بندھے ہوئے نہیں تھے۔ یعنی وہ ان چینی پرانی عورتوں میں سے نہیں تھی جن کی چال دیکھ کر ہمیشہ سرکس کے تنے ہوئے رستے کا خیال آتا ہے۔ جس پر سرکس والیاں چھاتا ہاتھ میں لے کر توازن برقرار رکھنے کی کوشش کیا کرتی ہیں۔

بڈھے ہانگ کا چہرہ ایک سوکھے ہوئے پپیتا پھل کی طرح تھا۔ زمانے کے سرد وگرم نے اُسے اچھی طرح سے کوٹ پیٹ کر اس پر طرح طرح کے نشان بنا دیئے تھے اس چہرے کو دیکھ کر آپ ایشیا کے پچھلے پچاس برس کی تاریخ پڑھ سکتے تھے۔ آنکھوں میں ڈر اور چالاکی اور اندھی جہالت آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اور جھریوں کی لکیریں۔ غلامی کی زنجیر در زنجیر بائیں رخسار پر زخم کا سیاہ نشان جو رخسار کی ہڈی سے شروع ہو کر جبڑے تک چلا گیا تھا۔ یہ زخم اسے ہانگ کانگ میں ملا تھا۔ جب رکشے کو دھیما چلانے کے جرم میں اسے ایک گورے نے دھر کے پیٹا تھا۔ ٹھوکروں سے، مکّوں سے اور چابک سے۔ ایسے ایسے اس کی پیٹھ پر اور اس کے جسم کے دوسرے حصوں پر کئی نشان تھے۔ پچاس برس کی تاریخ کے سیاہ سنگ میل جو اس کی زندگی میں ایک صیاد کی طرح اُبھرے اور ایک جلّاد کی طرح اپنی بے رحمی کے نشان چھوڑ کر آگے چلے گئے۔ بہار کیسے آتی ہے، شگوفے کیسے پھوٹتے ہیں پھول کیسے کھلتے ہیں۔ شاخ بارثمر کیسے سر جھکاتی ہے؟ ان چیزوں کا اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ اس کی زندگی نے پہلے تو ایک بہت بڑی بھوک دیکھی تھی پھر ایک بڑی چٹان دیکھی، پھر ایک بہت بڑا صحرا دیکھا اور جب وہ یہاں تک پہنچا تو اس کی ہمت نے اسے جواب دے دیا اور اس نے سوچ لیا کہ جدّ و جہد کرنا فضول ہے۔ زندگی ایسی ہے اور ایسی ہی رہے گی۔ اس میں بے شمار لوگ بستے ہیں اور چند لوگ مزے کرتے ہیں، چند لوگ عزّت پاتے ہیں اور بیشمار لوگ بے عزّتی سہتے ہیں اور اس کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ کیونکہ اونچے دیوتاؤں نے جو آسمان کے اوپر رہتے ہیں۔ یہ زندگی ایسے ہی بنائی ہے۔ اس میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرنا بھی گناہ ہے اور جب اس نے یہ سوچ لیا تو اس نے اپنے بادبان گرا دیئے اپنا مستول جھکا دیا اور اپنی کشتی کو کھینچ کر بمبئی کے ساحل پر لے آیا۔ اب وہ دس سال سے بمبئی کے ایک

گندے محلے کمائی پورہ میں رہتا تھا۔ یہاں اس نے ایک چینی طوائف سے شادی کر لی تھی۔ وہ اس کا خاوند بھی تھا اور دلال بھی۔ دن کو خاوند کا حق جتاتا تھا اور رات کو دلالی کرتا تھا افیم کھاتا تھا۔ چانڈو پیتا تھا اور کبھی کبھی غصہ آنے پر اپنی پہلی بیوی کی بیٹی ذی ای کو پیٹ بھی لیا کرتا تھا۔ آٹھ سال اسی شغل میں اچھے گذر گئے مگر آسمان کے اونچے دیوتاؤں کو اس کا آرام اور سکون کب گوارا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس کی طوائف بیوی کو اس سے چھین لیا اور جب وہ چند دن بیمار رہ کر اگلے جہان سدھار گئی تو بڈھے ہانگ کو اور اس کی بیٹی ذی ای کو جو اب جوان ہو گئی تھی۔ کاغذ کے پھول اور پنکھے بیچنے کا دھندا کرنا پڑا اور آج آسمان کے دیوتاؤں نے اس پر ایک اور ظلم ڈھایا یعنی مجھے اس کے بالمقابل پھول بیچنے پر مجبور کر کے کرافورڈ مارکیٹ بھیج دیا۔ بڈھے ہانگ کانگ کی آنکھوں میں خوف اور چالاکی اور اندھی جہالت کی گہری نفرت مجھے دیکھ کر چمک اٹھی اور اس نے اپنی بیٹی سے چینی زبان میں کچھ کہا اور اس نے بھی میری طرف نفرت سے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔

حالانکہ میں نفرت کے لائق نہ تھا۔ مجھے بھی مجبور کر دیا گیا تھا۔ رنگوں سے مجھے شروع ہی سے بڑی دلچسپی تھی۔ اور دسویں تک مجھے جس کلاس میں سب سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ یہی آرٹ کی کلاس تھی۔ میں دن بھر تصویریں بناتا رہتا۔ طرح طرح کے پھول اور نقش و نگار اجاگر کرتا رہتا اور دوسرے مضامین کی طرف بہت کم دھیان دیتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں دسویں میں فیل ہو گیا اور میرے چچا نے جو میرے ماں باپ کے مر جانے کے بعد میرے اخراجات کے کفیل ہوئے تھے، مجھے آگے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ اور اس کے تھوڑے دنوں بعد جب دفتر میں تخفیف ہوئی اور وہ باہر نکال دیئے گئے تو انہوں نے بھی اپنے گھر میں تخفیف کی اور مجھے باہر نکال دیا اب مجھے وہاں سونا پڑا جہاں چند ایک رذیلوں کو چھوڑ کے بمبئی کے

سارے شریف آدمی سوتے ہیں۔ یعنی فٹ پاتھ پر۔ فٹ پاتھ پر سوتے سوتے پہلے دو
چار دن تو بڑے عجیب عجیب سے خواب آئے۔ مثلاً میں نے دیکھا کہ میرے پاس ایک
گاڑی ہے اور میرے چچا اس کے ڈرائیور ہیں۔ میں یونیورسٹی کا وائس چانسلر ہوں اور ان کے
ممتحنوں کو ڈانٹ رہا ہوں جنہوں نے مجھے دسویں میں فیل کر دیا تھا۔ میں پیرس میں ہوں اور دنیا
کے بڑے بڑے آرٹسٹ مجھے اپنی تصویریں دکھاتے ہیں اور میں حقارت سے ان کی
تصویریں دیکھ کے کہتا ہوں۔ چھی۔ کیا بیہودہ آرٹ ہے تمہارا۔ لیکن اس کے بعد جب
مجھے دو چار فاقے لگے اور رات کو خواب میں بھی روٹیاں نظر آنے لگیں تو میں نے سوچا کہ کچھ
کرنا چاہیئے۔ سب سے پہلے میں نے کلرکی کی کوشش کی۔ معلوم ہوا کہ کلرکی کے لئے گریجویٹ
ہونا اور گریجویٹ ہو کر کسی بڑے آدمی کا سالا ہونا بہت ضروری ہے۔ اس کے بعد میں نے ایک
حجام کے ہاں نوکری کر لی۔ حجام بال کاٹتا تھا اور میں سر پر برش پھیرتا تھا۔ تھوڑے دنوں میں حجام
نے اپنی دوکان بند کر دی کیونکہ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ بمبئی میں فاقے، بیکاری، بھوک اور
راشن سے لوگوں کے سر کے بال اُڑتے جا رہے ہیں۔ پہلے لوگ حجام سے بال کٹوانے کے لئے
آتے تھے۔ اب خالی سر پر برش پھروانے کے لئے آنے لگے اور حجام نے مجبور ہو کر اپنی دُکان
بند کر دی۔ آج کل وہ عارسوا میں مچھلیاں پکڑتا ہے۔ اس کے بعد میں نے مل میں نوکری کی۔
پھر سٹرائیک کی پھر پکڑا گیا پھر تین مہینے جیل میں بند رہا۔ اس کے بعد مل مالکوں نے سب جگہ
میرا حقہ پانی بند کر دیا۔ یعنی جات باہر کر دیا۔ اب مجھے کسی مل میں کام نہیں ملتا تھا۔ ناچار میں
نے خوانچہ والے کا کام کیا۔ ایرانی ہوٹل کے ہاں ملازمت کی مگر کہیں پاؤں نہیں جمے۔ آخر کار
سوچ سوچ کر میں نے کاغذ کے پھول تیار کر کے انہیں کرافورڈ مارکیٹ کے سامنے بیچنے
کا کام شروع کیا۔ میں ایک عرصہ سے دیکھ رہا تھا کہ یہاں ان پھولوں کی اچھی خاصی بکری ہو

جاتی ہے۔ بہت سے چینی اس کاروبار میں لگے ہوئے ہیں چند ایک دلیسی لوگ بھی ہیں مگر ہاتھ کی صفائی میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس لئے دو چار روز کے بعد ہی کولانورڈ مارکیٹ کے سامنے سے کہیں اور چلے جاتے ہیں یا شائد کہیں اور کوئی دھندا کرتے ہوں گے۔ اس لئے یہاں جو چینی پھول بیچنے والے نظر آتے ہیں۔ وہ مستقل نظر آتے ہیں۔ وہ مستقل نظر آتے ہیں مگر اپنے دیسی لوگ جو نظر آتے ہیں وہ بیچ بیچ میں نظر آتے ہیں۔ وہ بیچ بیچ میں گم ہو جاتے ہیں۔ دو تین چینی کالیا دیری روڈ کو جانے والی سڑک کی طرف کھڑے رہتے ہیں۔ دو چار بوری بندر جانے والی سڑک کے سامنے، دو چار سنگل داس مارکیٹ کے سامنے موجود ہوتے ہیں۔ البتہ کرافورڈ مارکیٹ کے سامنے یہاں ٹرام کا جنکشن ہے وہاں صرف بڈھے ہانگ کانگ اور اس کی لڑکی ذی ای کو دیکھتا تھا۔ میں نے سوچا، یہاں ذرا مقابلہ کم ہے بکری کی گنجائش زیادہ ہوگی۔ اس لئے میں بھی اپنے پھول پتیاں لیکر وہیں جم گیا۔ میرا جمنا وہاں اتنا ہی ضروری تھا جتنا بڈھے ہانگ اور اس کی بیٹی ذی ای کا مجھے نفرت کی نگاہ سے دیکھنا۔

خیر بڈھے ہانگ کی نفرت کی تو مجھے اتنی پرواہ نہیں تھی لیکن ذی ای جیسی جوان خوب صورت لڑکی کی نفرت میں کیسے برداشت کر سکتا تھا اور پھر یہ بات بھی نہیں تھی کہ میرے پھول اس سے برے تھے۔ پھول کاٹنے کا سلیقہ مجھے آ گیا تھا۔ اگر جیب کاٹنے کا سلیقہ ابھی تک نہ آیا تھا۔ گر سنتھم کے گچھے دار پھول ایسے اچھے بنائے تھے میں نے کہ رات کی پارٹیوں میں شریک ہونے والے سستے قسم کے جذباتی لوگ انہیں ہاتھوں ہاتھ خرید کر لے گئے میرے گملوں میں جنگلی بیلوں کے سرخ گلاب دیکھ کر آپ بلبل کا چہکنا سن سکتے تھے اور سفید چنبیلی کے پھولوں کے ساتھ جھالر دار پتے اتنے اچھے کترے تھے میں نے کہ لوگ

ان سفید پھولوں کو ان جھالر دار تیوں کی خاطر ہی لے گئے۔ میرا خیال ہے کہ کاغذ کے پھول خریدنے والے لوگ بڑے گھٹیا اور احمق ہوتے ہیں۔ یہ لوگ نقلی عورتوں کے سامنے نقلی محبت کرتے ہیں۔ نقلی پھولوں کے ساتھ نقلی خوشبو لگا کے اپنا ڈرائنگ روم سجاتے ہیں اور نقلی اخلاق پر عمل کرتے ہوئے نقلی جنت کو سدھار جاتے ہیں۔ چنانچہ جب شام ہوئی تو میں نے اپنے سارے پھول بیچ دیئے۔ خالی گلاب کی ایک ڈنڈی باقی رہ گئی وہ میں نے ڈی ای کے حوالے کر دی تاکہ وہ اسے اپنے بالوں میں ٹانک لے مگر ڈی ای نے بڑی سختی سے اس ڈنڈی کو توڑ مروڑ کر پرے پھینک دیا اور بڈھے نے بڑے غصے سے مجھے گھور کر کہا۔
"آج تو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے لیکن اگر کل تم یہاں مجھے نظر آئے تو یا تو غنڈوں سے پٹوا دوں گا یا پولیس سے کہہ کر تمہیں گرفتار کرا دوں گا۔"

میں نے کہا۔" پولیس سب کی ہے۔ پولیس والا تمہارا کیا چچا لگتا ہے۔"

ہانگ نے کہا۔ میں یہاں خالی کھڑے ہونے کے لئے پولیس کے سنتری کو آٹھ آنے دیتا ہوں۔

میں نے اپنی بھری ہوئی جیب کے سکے کھنکائے اور اس سے کہا۔ تم اٹھنی دو گے تو میں بارہ آنے دوں گا اور دوسرے دن جب پولیس کا سنتری آیا تو میں نے یہی کیا۔ اس پر وہ بے چارہ ہانگ بہت مجبور ہو کر رہ گیا اور آخر کار اسے مجھ سے سمجھوتہ کرنا ہی پڑا۔ سمجھوتے کی پہلی شرط یہ تھی کہ میں اس کی لڑکی کو بھگا کے نہیں لے جاؤں گا۔ دوسری شرط یہ تھی کہ جو پھول وہ بیچتے ہیں وہ میں تیار نہیں کروں گا۔ تیسری شرط یہ تھی کہ میں کاغذ کے پھول لاکر نیچے لا کے نہیں بیچوں گا۔ یہ ان کی ملکیت رہے گی۔ آخری دو شرطیں میں نے مان لیں لیکن پہلی شرط جوں جوں دن گذرتے گئے اور مجھے ڈی ای اچھی سے اچھی اور اچھی سے اچھی

لگنے لگی۔ مجھے وہ پہلی شرط اکھڑنے لگی۔ لیکن ذی ای میری طرف بالکل توجہ نہ کرتی تھی اور یہ بڑی حوصلہ افزا بات تھی کیوں کہ میں اپنی چھوٹی سی زندگی کے چھوٹے سے تجربے کی بناء پر یہ ضروری جانتا تھا کہ جو لڑکیاں پہلی ہی ملاقات میں چھیڑ چھاڑ کرنے لگتی ہیں وہ نہایت خطرناک ہوتی ہیں اور کہیں آپ کا ہاتھ غلطی سے بھی ان کے کندھے کو لگ جائے تو فوراً پولیس تک معاملہ لے جاتی ہیں۔ مگر ذی ای ایسی نہ تھی وہ مجھ سے بہت کم گفتگو کرتی تھی اور اکثر اپنے غلافی پپوٹوں کے اندر سے مجھے یوں دیکھتی تھی کہ میں سوچتا تھا کہ ان غلافی پپوٹوں کے اندر کی آنکھوں کے اندر اور بھی کئی آنکھیں بند ہیں جو مجھ کو نظر نہیں آتی ہیں اور میرا دل اس کی نظر کے سامنے یوں کانپنے لگتا تھا جیسے سکول کا بچہ ہیڈ ماسٹر کے بید کے سامنے۔

بڈھے ہانگ نے میرے دل کی حالت کا اندازہ کر کے ایک دن جب ذی ای اس کے ساتھ نہیں آئی تھی۔ مجھ سے پوچھا۔ "تم ذی ای سے شادی کرو گے؟"

شادی؟ میں نے چونک کر کچھ اس سے کچھ اپنے آپ سے پوچھا۔

ہاں ہاں! بڈھے ہانگ نے ایک بڑی ہی چالاک مسکراہٹ کے ساتھ اپنے اپنے ٹوٹے ہوئے دانتوں والا منہ کھولتے ہوئے کہا۔ "ذی ای سے شادی کرو گے اور اب تم کر بھی سکتے ہو—— کماتے ہو اچھے خاصے —— شکل وصورت بھی معقول ہے۔ پڑھے لکھے بھی ہو اور میری —— ذی ای بھی کوئی ایسی ویسی نہیں ہے۔ وہ انگریزی بھی پڑھ سکتی ہے اور چینی بھی۔ سارے کمائی پورہ میں اس جیسے پھول اور کوئی تیار نہیں کرتا ہے —— نہ انگریزی ٹوپیاں —— نہ پنکھے۔ وہ کوئی اجڈ گنوار نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ اچھا میں ذی ای سے شادی کر لوں گا۔ گو میرا ارادہ اسے بھگا کے لے جانے کا تھا۔

ہانگ بولا ـــــــ وہ میں جانتا ہوں، ایسا بڈھو نہیں ہوں ۔ آدمی کی نظر پہچانتا ہوں ۔ مگر تم میرے جیتے جی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے ۔

میں نے کہا ـــــــ کوشش تو کی جا سکتی ہے ـــــــ کامیابی ہو نہ ہو۔ یہ بات آسمان کے دیوتاؤں پر چھوڑ دینی چاہیئے ۔

ہانگ بولا ـــــــ یہ بات تو میں پولیس والوں کے سپرد کر دوں گا ۔ آسمان کے دیوتاؤں پر اس معاملے میں ذرا کم بھروسہ کرتا ہوں ۔

میں نے کہا ـــــــ اچھی بات ہے تو میں بھگانے کا خیال چھوڑ دیتا ہوں شادی پر رضامند ہوا جاتا ہوں ۔ کتنے روپے لو گے ۔؟

ہانگ نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا ـــــــ ایک بُڈھا مالدار چینی جس کا فورٹ میں رستوران بھی ہے ۔ ذی ای کے ایک ہزار دیتا تھا ۔ میں نے بُڈھا سمجھ کے ہاں نہ کی ۔ تمہیں چھ سو روپے میں دے دوں گا ۔

چھ سو میں کہاں سے لاؤں گا ۔؟

ہانگ نے کہا ـــــــ قسطوں میں دے دینا ۔!

میں چپ ہو کر کچھ سوچنے لگا ۔

ہانگ نے کہا ـــــــ قسطوں میں کوئی حرج نہیں ہے ـــــــ آج کل تو ریڈیو ۔ گاڑی ـــــــ فرنیچر چیز قسطوں میں مل جاتی ہے ـــــــ تم چالیس چالیس روپیہ مہینہ بھی دو گے تو سال بھر میں ادا ہو جائیں گے ـــــــ اگلے سال تم شادی کر لینا ـــــــ !

میں نے کہا ـــــــ مجھے منظور ہے ۔ لاؤ ہاتھ ۔

بڈھے نے ہاتھ ملاتے ہوئے، مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا ـــــــــ آج سے تم سمجھو کہ میرے بیٹے ہو گئے ـــــــــ اس لئے ایک عقل کی بات کہتا ہوں ہر روز اپنی کمائی سے نکال کر مجھے دیتا جا ـــــــــ مہینے مہینے حساب کرنا بھی مشکل ہو جائے گا ـــــــــ روز کا بچاؤ تو بچ جاتا ہے ـ مہینے کے بعد بچانا بہت مشکل ہو جاتا ہے ـ مجھے تجربہ ہے اس بات کا ـ!

میں نے کہا ـــــــــ بہت اچھا ـ! روز کا سوا روپیہ مجھ سے لے لینا ـ باقی مہینے کے آخر میں ـ

"شاباش ـ" کہہ کر بڈھے ہانگ نے پھر مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہنے لگا مگر ذی ای کے کان میں اس کی بھنک نہ پڑنے پائے ـــــــــ نہ تمہارے سلوک سے نہ تمہاری کسی بات سے اسے پتہ چلے کہ ہم لوگ کیا کرنے والے ہیں ـــ! اور ہاں شادی سے پہلے میں اسے تم سے زیادہ بات چیت کا موقع بھی نہیں دوں گا ـ ہمارے ہاں یہ دستور نہیں ہے ـ

میں نے کہا ـ ہمارے ہاں بھی یہ دستور نہیں ہے ـ

بڈھے ہانگ نے کچھ کھانستے، کچھ ہنسنے کے بیچ میں کہا ـــــــــ اور یہ بہت اچھا دستور ہے ـــــــــ جب تک مرد عورت ایک دوسرے سے بات نہ کریں بھرم قائم رہتا ہے ـ مجھی کو لو ـــــــــ جب میں نے ذی ای کی ماں سے شادی کی مجھے پتہ نہ تھا کہ اس کی زبان کتنی تیز چلتی ہے ـــــــــ اور اسے بھی یہ پتہ نہ تھا کہ اس کے منہ سے بو آتی ہے ـــــــــ شادی کے بعد دونوں کا بھرم کھل گیا ـــــــــ !

ہاہاہا ـــــــــ !

ہاہاہا ——— میں بھی خوب ہنسا۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر میں نے اس سے پوچھا "ذی ای کی زبان کیسے چلتی ہے۔"

وہ بولا۔ فکر نہ کرو۔ چاندی کی گھنٹی ہے چاندی کی۔

اس واقعے کو چند ہفتے گذر گئے ——— میں ابھی تک ہانگ کو ڈیڑھ سو روپے ہی دے چکا تھا ——— کیوں کہ روزگار کئی دفعہ مندا پڑ جاتا تھا ——— مگر ہانگ بے چارہ میری مجبوری سمجھتا تھا ——— اس لئے چپکے سے جو رقم بھی دیتا تھا قبول کر لیتا تھا ——— میرا سلوک ذی ای سے اور ذی ای کا سلوک مجھ سے اس طرح تھا ——— یعنی کم گوئی اور کم نگاہی بلکہ اکثر تو اس کی طرف سے شدید عدم توجہی کا اظہار ہوتا تھا ——— جو مجھے گاہے گاہے سخت پریشان کر دیتی ——— اور میں اپنی دلی حالت اس پر ظاہر کرنے کے لئے بے تاب ہو جاتا۔

آخر ایک روز مجھے موقعہ مل گیا۔ مون سون کے دن تھے ——— موسلادھار بارش ہو رہی تھی ——— میں اپنے کاغذ کے پھولوں کو لئے ٹرام سٹینڈ کے اندر دبکا کھڑا تھا ——— میرے قریب ہی ایک بڈھا مونگ پھلی پر کوٹلوں کی چھوٹی سی ہنڈیا رکھے بیٹھا تھا۔ ایک بھک منگا لڑکا ——— اپنے چیتھڑوں سے بدن ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دانت بجا رہا تھا ——— اس کے پتلے پتلے بازوؤں پر اور ٹانگوں پر کھال منڈھی ہوئی نظر آرہی تھی اور اس کا پیٹ آگے کو بڑھا ہوا تھا ——— !

چاروں طرف زور کی بارش ہو رہی تھی ——— لوگ دوکانوں میں دبکے کھڑے تھے ——— سڑکوں پر کہیں کہیں شگفتگی نظر آجاتی یا پھر بند موٹریں شیشے چڑھائے ہارن بجاتی ہوئی اِدھر اُدھر گزر جاتیں ——— کھڑے کھڑے دن ڈھل

گیا۔ شام ہوگئی۔ بتیاں جگ اٹھیں ــــ لیکن بارش بند نہیں ہوئی ــــ ٹرام اور بس کا چلنا بھی بند ہوگیا۔ بارش بند نہ ہوئی ــــ میں چپ چاپ چھپتے ہوئے ٹرام سٹینڈ کے ایک کونے میں اپنے کاغذی پھول لئے ذی ای اور بڈھے ہانگ کے انتظار میں کھڑا رہا۔ آج دن بھر سے ذی ای کو نہ دیکھا تھا روز دیکھتا تھا اس لئے نہ دیکھنے کی خلش سے ناواقف تھا۔ آج معلوم ہوا کہ جسے روز روز جی جان سے دیکھا جائے اسے روز کا نہ دیکھنا کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے ــــ آج بارش کتنی اداس ہے۔ مارکیٹ کے سامنے کے کھمبے کتنے اکیلے ہیں۔ سڑک کتنی سنسان ہے۔ ٹرام کی لائن کتنی دور تک چپ چاپ اپنے سینے میں کسی غم کو چھپائے چلی گئی ہے۔ زندگی جو کل تک کاغذ کے پھولوں کی طرح کھل اٹھی تھی آج کس طرح ایک کلی کی طرح بند ہوگئی ہے جیسے اس نے محبت کے سارے دروازے مجھ پر بند کر دیئے ہوں ــــ اور مجھے باہر سڑک پر ٹرام سٹینڈ پر کھڑا کر کے خود کہیں چلی گئی ہو۔

یکایک کسی نے میرے قریب آکر مجھ سے پوچھا۔ آج کتنے پھول بکے؟

پوچھنے والے نے سوال اتنے قریب سے آکے کیا کہ اس کے سانس کی حدت میرے رخساروں کو چھو گئی اور جب میں نے اُسے دیکھنے کے لئے سر اٹھایا تو اس نے جلدی سے اپنا چہرہ پرے کر لیا ــــ اور میری آنکھوں میں ذی ای کی غلافی آنکھوں کی چمک دوڑ گئی ــــ ہاں! یہ ذی ای ہی تھی۔ اکیلی بارش میں بھیگی ہوئی، خوشبو کی طرح اڑتی ہوئی، بھیگے بالوں میں بھیگی خوشبو لئے اس کے بھیگے بھیگے ہونٹوں پر ایک عجیب سی چمک ہویدا تھی۔

میں نے کہا۔ "اس بارش میں تم اکیلے اس وقت کیسے آگئیں۔ اور ہانگ کہاں ہے؟"

اس نے کہا ۔ "انہوں نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے سوا روپیہ لانے کے لئے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر سے دوائی لانی ہے۔"

میں نے چپکے سے سوا روپیہ دے دیا۔

وہ بولی۔ یہ سوا روپیہ کہاں سے آیا۔ آج تو پھول بکے نہیں ہوں گے۔

میں نے کہا۔ کل کے بچے تھے۔

وہ بولی۔ کل بھی تو سوا روپیہ دیا تھا۔

میں نے کہا۔ تمہیں کیسے معلوم ہے۔؟

وہ بولی۔ میں سب جانتی ہوں۔

میں چپ رہا۔

وہ بولی۔ کب تک آپ یہ سوا روپیہ دیتے رہیں گے؟

میں نے کہا۔ جب تک چھ سو پورے نہیں ہو جاتے۔

ذی ای نے ایک آہ بھری۔ بولی۔ وہ آپ سے چھ سو لے رہے ہیں۔ ایک اور سے آٹھ سو معاملہ کر رکھا ہے۔ تیسرے سے بارہ سو کا سودا ہوا ہے۔ ذی ای تو ایک ہے شادی تین جگہ کیسے ہو گی؟

میں ہکا بکا ہو کر اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ میری حیرت دیکھ کر بولی۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں۔

میں نے غصے میں آ کر کہا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔

ذی ای نے ایک آہ بھری۔ بولی۔ اس سے بھی بڑی بڑی باتیں ہم نے دیکھی ہیں۔ لیکن میں نے تمہارے ساتھ کوئی بُرا سلوک تو نہیں کیا ——— میں نے اور بھی

برافروختہ ہو کے کہا۔

ذی ای نے ایک بڑے اداس اور پھیکے لہجے میں، جس میں بے انداز تھکن موجود تھی، میری طرف مڑ کے کہا ——— کیا یہ سودا کرنے سے پہلے آپ نے مجھ سے پوچھ لیا تھا ——— ؟ کیا آپ کو معلوم نہ تھا کہ چینی عورت کے پاؤں اب بندھے ہوئے نہیں ؛ اب وہ اپنے پاؤں سے چل کر کہیں جا سکتی ہے ۔!

جس انداز سے اس نے "کہیں" کہا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ میرے قریب سے اٹھ کر کہیں دور چلی گئی ہے اور شاید وہ کہیں بہت دور چلی گئی تھی ——— ہندوستان سے آگے ——— برما سے آگے ——— سیام سے آگے ——— ہند چینی سے آگے، چین کے کھیتوں میں اس کی نگاہ پڑ رہی تھی۔

وہ بولی۔ بہت آہستہ آہستہ!

آج مجھے اپنا دیس یاد آرہا ہے۔ جہاں لوگ نئی زندگی کے لئے لڑ رہے ہیں جہاں میری جیسی لڑکیاں بھی مردوں کے دوش بدوش لڑ رہی ہیں۔ ایک میں ہی یہاں سڑ رہی ہوں ۔!

کاش کوئی مجھے کہیں سے پر دے دیدے ——— میں آج ہی اسی وقت اُڑ کر پر لگا کر وہاں پہنچ جاؤں، جہاں یہ لڑائی ہو رہی ہے۔

یہ کیسی لڑائی ہے ——— ؟ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

ذی ای آج بول رہی تھی۔

اس نے جواب نہیں دیا ——— پھر ایک لمبے وقفے کے بعد بولی۔ تم جانتے ہو میرا اصلی نام ذی ای نہیں ہے۔

نہیں ——— !

میرا اصلی نام کچھ اور تھا۔ یہ نام میں نے خود رکھا ہے۔ ذی ای ایک بہادر چینی لڑکی تھی جو چیانگ کائی شیک کے ظلم کے خلاف بہادری سے لڑتی ہوئی شہید ہوگئی۔ میں بھی ذی ای کی طرح لڑنا چاہتی ہوں۔

کس لئے۔؟

وہ بولی۔ تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ اچھا کوشش کرتی ہوں......

سنو..... جہاں ہمارا گاؤں ہے وہاں ہان ندی بہتی ہے۔ ہمارے گاؤں کا نام۔ کوانگ شا ہے۔ وہاں پر ناشپاتیوں کے جھنڈ ہیں اور آڑو کے پیڑ ہیں اور ندی کے کنارے کنارے وتو کے درخت اپنی شاخیں ندی پر جھکائے دُور تک چلے جاتے ہیں۔ گھاٹی کے اُوپر سارے گاؤں کے اُوپر نگاہ رکھتا ہوا بوڑھے سردار اُو کا گھر ہے جس نے میرے باپ کی زمین چھین کر اسے گاؤں سے باہر نکال دیا تھا۔ اُس وقت میں صرف چار سال کی تھی۔

گاؤں سے کیوں نکالا۔؟

اس لئے کہ قرضہ نہ دیا جا سکا۔ جو بوڑھے سردار نے میرے باپ کو میری ولادت پر دیا تھا۔

یکایک مجھے اپنے چچا کے گھر سے نکلنا یاد آگیا۔ میں نے کہا۔ ارے اب میں سمجھ گیا۔

کیسے۔؟ وہ بولی

بس اپنے تجربے سے۔!

اپنا تجربہ بہت ضروری ہے۔

اچھا آگے بتاؤ۔

وہ بولی - پھر ہم اپنے گاؤں سے دوسرے گاؤں میں آگئے - وہاں ہم دوسرے لوگوں کے کھیتوں میں مزدوری کرتے رہے - میری ماں بہت خوب صورت تھی۔

میں نے کہا - اس کا مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے -

ذی ای شرمائی - کچھ خوش ہوئی - بولی تم تعریف کر چکو تو آگے چلوں۔

اچھا آگے چلو -!

چونکہ میری ماں بہت خوب صورت تھی اور ہم لوگ بہت غریب تھے اس لئے وہ دوسرے لوگ جن کے کھیتوں میں ہم کام کرتے تھے - ہم سے کام کرانے کے بعد عیش بھی چاہتے تھے - میرے باپ کو یہ منظور نہ ہوا - اس لئے ہم اس گاؤں سے بھی نکل آئے۔

پھر - ؟

پھر بہت سخت کال پڑا - لوگ بھوک سے مرنے لگے - میرے باپ نے تنگ آکر اپنی بیوی کو ایک امیر بڈھے کے پاس دو ہزار میں بیچ دیا۔

تمہاری ماں کو - ؟

ہاں اسی کو - !

ان دو ہزار ڈالروں سے ہم ہانگ کانگ آئے - سُنا تھا وہاں رکشہ کا اچھا بزنس ہوتا ہے - میرے باپ نے ایک رکشہ خرید لی اور رکشہ چلانے لگا - گورے لوگ شراب پی کر دنگا تو اکثر کرتے ہیں - لیکن ایک دن میرے باپ کو ایک گورے نے اتنے چابک مارے کہ بے ہوش ہو گیا - پھر گورے نے اس کی رکشا کو آگ لگا دی -

دو ہزار ڈالر جل گئے پھر - ؟ میں نے پوچھا۔

پھر اُس نے کہا۔ پھر میرے باپ نے مجھے بیچنا چاہا۔ لیکن میں بہت چھوٹی تھی بہت کمزور تھی۔ بہت دُبلی پتلی تھی۔ کوئی مجھے خریدنے پر تیار نہ ہوا۔ آخر ایک پادری نے مجھے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ نوکرانی۔ پادری کی بیوی انگریزی پڑھانے لگی۔ وہ بڑے اچھے دن تھے۔ میں اچھی خاصی تندرست ہوگئی مگر میرے باپ کو کوئی نوکری نہ ملی۔ اس لئے اس نے ایک انگریزی کمپنی کے گودام میں چوری کی اور پکڑا گیا اور دو سال کی اسے جیل ہوگئی۔

میں چپ چاپ سن رہا تھا۔

وہ بولی۔ اس نے چاول چرائے تھے گودام سے کیونکہ وہ بھوکا تھا اور وہ اس لئے بھوکا تھا کہ اس کے چاول اس کے کھیت سے چرا کر چیانگ کائی شیک کی سرکار نے انگریزوں کے گوداموں میں بھر دیئے تھے اور امریکنوں کے گوداموں میں ان لوگوں نے نہ صرف اس کے چاول چرائے تھے بلکہ اس کے کھیت بھی ہتھیا کے سردار اُ کو دے دیئے تھے۔

وہ دیر تک چپ رہی۔

میں نے کہا پھر؟

وہ بڑی بے دلی سے بولی۔ پھر ہم سنگاپور آ گئے۔ سنگاپور سے ملایا گئے۔ وہاں ربڑ کے باغوں میں کام کرتے رہے

وہاں سے برما آ گئے پھر بمبئی آ گئے۔ آگے تم جانتے ہو۔

اور اب؟ میں نے پوچھا۔

اور اب میں تم سے کہتی ہوں کہ تم میرے باپ کو سوا روپیہ دینا بند کر دو۔ میں تم سے یا کسی سے بھی شادی نہیں کروں گی۔

کیوں۔؟

میں واپس چین چلی جاؤں گی جس دن میرے پاس روپیہ ہوا۔ میں چین چلی جاؤں گی۔

تو پھر تو مجھے ڈیڑھ روپیہ دینا چاہیئے۔

وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ بولی۔ میں یہ روپیہ لے کر چین چلی جاؤں گی تو تمہیں کیا ملے گا۔؟

میں نے کہا۔ میں انتظار کروں گا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ بولی۔ میں تو اتنی اچھی نہیں ہوں۔ خاک بھی اچھی نہیں ہوں تم میرا خیال نہ کرو۔ دیکھو تمہارے ہندوستان میں کتنی اچھی لڑکیاں ہیں۔ ان کی ناک کتنی اچھی ہے۔ آنکھیں کتنی بڑی بڑی نکیلی جیسے ابھی چہرے سے باہر نکل پڑیں گی۔ ہائے ایسی اچھی آنکھیں تو میں نے کہیں بھی نہیں دیکھیں یہ تم کو کیا ہوا ہے۔؟

میں نے کہا۔ تم جاؤ۔ میں انتظار کروں گا۔

وہ میرے قریب آ کے بولی۔ مجھے بھوک لگی ہے۔

میں نے کہا۔ اب میرے صرف مونگ پھلی کے پیسے رہ گئے ہیں۔ میں نے مونگ پھلی والے سے کہا۔ دو آنے کی مینگ دے دو۔

وہ بولی۔ مینگ پھلی کو کہتے ہیں؟ بالکل چینی نام معلوم ہوتا ہے مینگ۔

مونگ پھلی کھاتے کھاتے کئی بار ہاتھوں میں ہاتھ اُلجھے لیکن اُلجھ اُلجھ کر پھر سُلجھ گئے۔ اس کی آنکھوں میں کم نگاہی بے حد عمیق ہو چکی تھی۔ وہ کانپ رہی تھی۔ میں بھی کانپ رہا تھا۔ اور چاروں طرف بارش ہو رہی تھی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا۔ چاروں طرف لوگ ہیں پھر بھی کیسی تنہائی ہے۔

میں نے کہا۔ اور کتنی اچھی تنہائی ہے۔

وہ ہنسی۔ بولی۔ اب میں جاتی ہوں۔

میں نے اس سے تو کچھ نہیں کہا اپنے دل سے صرف اتنا کہا ۔ اب یہ کہیں بھی چلی جائے اس سے کچھ نہ ہوگا۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔

اور بہت سا وقت گذر گیا۔ وقت گذرنے کا پتہ صرف شام کے اخباروں سے معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ پتہ چلتا تھا کہ پی پنگ ختم ہو گیا۔ پی کنگ فتح ہو گیا۔ سنگھائی ختم ہو گیا۔ ماؤ کی فوجیں چین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئیں اور ہانگ کانگ کی ساحلی دیواروں سے ٹکرانے لگیں۔ جس روز یہ ہوا یعنی چین کی فوجیں ہانگ کانگ کی سرحد پر پہنچ گئیں اسی روز ہماری محبت کی سرحد بھی آن پہنچی۔

وہ بولی۔ بس اب کرایہ ہو گیا۔

میں نے کہا۔ لڑائی تو یہاں بھی لڑی جا سکتی ہے۔

اس نے کہا۔ وہ تمہارا کام ہے۔ میں وہاں جاؤں گی۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ دنیا تو جگہ جگہ سے ٹوٹی پڑتی ہے۔ اس کام کو تو یہاں سے بھی شروع کیا جا سکتا ہے۔ آؤ ہاتھ میں ہاتھ دو۔

وہ ہچکچائی۔ کچھ سوچنے لگی۔ تھوڑی دیر اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں رہا پھر نرمی اور ملائمت سے اُسنے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اور میرا ہاتھ اکیلا رہ گیا۔

اس نے کہا۔ مجھے جانے دو۔ مجھے اپنے وطن جانے دو میں یہاں رہی تو کبھی خوش نہ ہوں گی۔ ہاں وہاں جا کے سوچوں گی

میں نے کہا۔ اچھا میں انتظار کروں گا۔

جانے سے پہلے ہانگ اور ذی ای میں بڑے زور کی لڑائی ہوئی۔ بڈھا ہانگ واپس

نہیں جانا چاہتا تھا اور یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی واپس چین چلی جائے۔ اس لئے وہ زیادہ دھویا۔ اس نے ڈی ای کو دھمکایا۔ مارا پیٹا۔ معاملہ پہلے پولیس میں اور بعد میں عدالت تک لے گیا مگر ڈی ای بالغ تھی اور اپنے وطن جا سکتی تھی اور دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی تھی۔ محبت کے مضبوط ہاتھ بھی اسے روک نہ سکے اور وہ بمبئی سے کلکتے اور کلکتے سے ہانگ کانگ چلی گئی۔ جانے سے قبل کوئی زیادہ بات چیت مجھ سے نہیں ہوئی۔ الوداع کے وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں تھے۔ خوشی کی چمک تھی اور ایک عجیب بے قراری اور بے تابی۔ ہاں بالکل روانہ ہوتے وقت اس نے ایک بار مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑا اور میرے کان میں کہا۔ میں ضرور آجاؤں گی۔ میرا انتظار کرنا۔

اور وہ چلی گئی۔

اور اس کے جانے کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سارے جہان کی خوشبوئیں پر لگا کے اس کے ساتھ اڑ گئی ہیں۔ اور میرے ہاتھ میں صرف کاغذ کے پھول رہ گئے ہیں۔

بڈھا ہانگ اسے رخصت کرنے کے لئے بھی نہیں آیا۔ اس کے بعد مجھے بھی نہیں ملا۔ شاید اس نے پھول بیچنے کا دھندا ہی بند کر دیا۔ بعد میں مجھے ایک چینی پھول بیچنے والے سے پتہ چلا کہ اس نے ایک چینی طوائف سے شادی کر لی ہے اور ہر وقت افیون کی پینک میں مست رہتا ہے۔

بہت عرصے کے بعد مجھے ڈی ای کا خط ملا۔

پیارے۔!

یہ خط میں تمہیں اپنے گاؤں سے لکھ رہی ہوں جو ہان ندی کے کنارے واقع ہے

ہاں ناشپاتیوں کے جھنڈ ہیں اور ان پر فیروزے اور پکھراج کی سی خوب صورت پتیاں نکھر رہی ہیں۔ آڑو کے درختوں پر سفید سفید پھول کھلے ہیں اور وہاں جہاں سردار اُو کا گھر تھا وہاں اب ہمارے گاؤں کا اسکول ہے۔ زمین ہم سب کسانوں کو پھر سے مل گئی ہے۔ اپنی ماں کا پتہ بھی میں نے چلالیا ہے اور اسے اپنے ساتھ لے آئی ہوں۔ جس زمیندار نے اُسے قحط کے دنوں میں میرے باپ سے خریدا تھا وہ آج کل وطن سے غدّاری کرنے کے جرم میں اور بلیک مارکیٹ کرنے کے جرم میں جیل میں بند ہے۔ یہاں مجھے استانی کا کام سونپا گیا ہے جانتے ہو میں اب بچوں کو انگریزی پڑھاتی ہوں۔ کیا تم کبھی یہ سوچ سکتے ہو کہ تمہاری ڈی ای بچوں کو سکول میں انگریزی پڑھائے گی۔ کبھی کبھی میں خود سوچتی ہوں تو خوشی سے اچھل پڑتی ہوں۔ ایسی خوشی کیا کبھی ممکن تھی۔ کن مصیبتوں سے ہم نے آزادی حاصل کی ہے۔ سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے۔ میں نے اس آزادی کے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ اب ساری زندگی بھی اس کام میں لگا دوں تو کم ہے۔

تم یہاں کبھی آجاؤ تو کیسا رہے۔ حیران رہ جاؤ گے یہ دیکھ کر کہ کیا یہ وہی چینی ہیں۔ یہ وہی گاؤں ہے۔ ساری دھرتی بدل گئی ہے۔ میں سمجھتی ہوں ہماری گاؤں کی چڑیوں تک کو یہ احساس ہو گیا ہے کہ ہم لوگ آزاد ہو گئے ہیں۔ اپنے ضمیر کے خود مالک ہیں۔

جب تم یاد آجاتے ہو تو تمہیں دیکھنے کی خواہش کرتی ہوں۔ یہاں پر ایک لڑکا جو اکثر تمہیں بھلا دینے کی کوشش کیا کرتا ہے۔

تمہاری ڈی ای

میں نے ڈی ای کے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کئی بار خط لکھ کر پھاڑ دیا۔ ادھر [illegible] پیالیاں بھی [illegible] گئی تھیں۔ رنگین کاغذ کے دام بڑھ گئے۔ بیلوں اور شاخوں

میں جو تار خرچ ہوتا تھا اس کے دام بیوپاریوں نے بڑھا دیئے۔ مہنگائی ہونے سے لوگ کاغذ کے پھول کم خریدنے لگے۔ لوگوں کے پاس اپنے کپڑوں کے لئے پیسے نہ رہے۔ تو وہ کاغذ کے پھول خرید کے کیا کرتے۔ میں اکثر بھوکا اور بیکار رہنے لگا۔ چڑچڑا اور پریشان دو تین دفعہ پولیس والوں سے تو تو میں میں ہوئی۔ مجھے خود آمدنی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی اس سنتری کو بھلا بارہ آنے روز کہاں سے دیتا۔ سنتری نے مجھے دو تین روز بڑے پیار محبت سے سمجھایا۔ بتایا کہ وہ رشوت خور نہیں ہے۔ رشوت سے اسے سخت نفرت ہے مگر اس کے گھر میں بیوی بیمار ہے۔ دوا کے لئے تنخواہ میں سے پیسے نہیں بچتے۔ مہنگائی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ خالی خولی ایمانداری سے پیٹ نہیں بھرتا اور پیٹ بڑی بلا ہے مگر میرے پاس پیسے کہاں سے آتے تھے جو میں اسے دیتا۔ ناچار غصے میں آکے اس نے مجھے حوالات میں بند کر دیا۔ آوارہ گردی کے الزام میں مجھے پندرہ دن کی قید ہو گئی۔

جب میں قید سے چھوٹ کے آیا تو مجھے ذی ای کا ایک اور خط ملا۔

پیارے!

تم نے میرے پہلے خط کا جواب نہیں دیا۔ جلدی لکھو کیا بات ہے؟ یہاں پر اب کہ ہمارے گاؤں میں فصل ڈیوڑھی ہے پر کسی زمیندار کو فصل کا حصہ نہیں دینا پڑا۔ ساری کی ساری فصل اپنی ہے۔ چیزوں کی قیمتیں گھٹ گئی ہیں۔ گھٹتی جا رہی ہیں اور معاشی حالات جو بگڑ چکے تھے اب اپنے ٹھکانے پر آ رہے ہیں۔

کل ہمارا قومی تہوار کا دن تھا۔ سارے گاؤں میں ہنڈولے جگائے گئے۔ چراغاں ہوا ناچ اور گانے۔ اسکول کے باہر گاؤں والوں نے مل کے ایک بہت بڑا جلسہ کیا۔ اس موقع پر میں نے ایک بہت بڑا ہنڈولا تیار کیا جو چکر کھا کر گھومتا تھا جیسے سرکس میں

کے ہنڈولے گھومتے ہیں ۔ گاؤں والوں نے میری کاری گری دیکھ کر خوش ہوئے اور مجھے ایک چاندی کا تمغہ انعام میں دیا۔ اسکول میں بھی میرے کام کو بہت پسند کیا جارہا ہے ۔ کیا تم میری کسی بات سے خفا ہو ؟

تمہاری

ذی ای

اس خط کا میں نے یہ جواب دیا۔

پیاری ذی ای

خوش رہو میں ابھی پندرہ دن کی جیل کاٹ کے آیا ہوں۔ تمہیں خط لکھ رہا ہوں میرا گناہ یہی تھا کہ میں بیکار تھا۔ مجھے میری بیکاری کی سزا ملی۔ حالانکہ یہ سزا اس وزیر کو ملنی چاہیئے تھی جس کے راج میں بے کار ہوا۔ یہاں کام کا بہت مندا ہے ۔ آج کل پھول نہیں بکتے۔ اناج مہنگا ہو گیا ہے۔ کپڑا بھی مہنگا ہو گیا ہے ۔ ہر چیز کے دام بڑھتے جارہے ہیں۔ سوچتا ہوں ایسا یہاں کیوں ہو رہا ہے کیا یہاں قیمتیں بڑھ رہی ہیں اور تمہارے ہاں گھٹ رہی ہیں ۔ ایسا میں تمہاری محبت کی وجہ سے نہیں سوچتا بلکہ آس پاس کے حالات کی وجہ سے سوچتا ہوں اور نہ بھی سوچوں تو کیا کروں ؟

یہ جان کر بہت خوش ہوں کہ تم خوش ہو۔ میری خوشی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس لڑکے کا معاملہ جو مجھے تمہارے دل سے بھلا دینے کی فکر میں ہے اس کی مجھے زیادہ فکر نہیں ہے ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں ۔ تم کیا کرتی ہو۔ اس کی مجھے فکر کیوں ؟

تمہارا اپنا

اس کے بعد جب کوریا کی جنگ شروع ہوئی تو اس کا خط آیا۔ جس میں اس نے لکھا تھا۔

"اس جنگ نے میری زندگی کے سارے ارادے بدل دیئے ہیں۔ اب میں وہ کبھی نہیں ہوسکتی جیسے میں پہلے سوچتی تھی۔ اب میں کوریا کی جنگ میں چینی والینٹر بن کے جارہی ہوں وہاں نرس کا کام کروں گی اور اگر کبھی زندہ رہی تو شاید تم سے ملنے کی کوئی صورت نکل سکے ورنہ الوداع

آخری فقرہ یہ تھا" اچھا تو یہی ہے کہ مجھے دل سے بھلا دو۔ ہم وہاں ملے جہاں حالات ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ ایک بہاؤ پر نہیں ملے۔ مخالف بہاؤ پر ملے اس لئے ایک لمحے کے لئے رک کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ اب میں تو خندقوں، گولیوں اور آہنی باڑھوں کے رستے پر جارہی ہوں۔ اپنے کاغذی پھولوں کو میرے راستے سے ہٹا دو۔ پیارے میرے وطن کی زندگی، کوریا کی زندگی، سارے ایشیا کی زندگی خطرے میں ہے۔"

اس کے بعد اس کا کوئی خط نہیں آیا۔ میں اس کے باپ سے ملنے گیا لیکن وہ تو ہمیشہ کے لئے اپنی بیٹی کو دل سے بھلا چکا تھا اور ذی ای بھی اس سے ناطہ توڑ چکی تھی۔ کسی ایک خط میں بھی اس نے اپنے باپ کے بارے میں نہیں پوچھا۔ ایک آخری مجبوری تھی وہ بھی ہمیشہ کے لئے کٹ گئی۔ اب ذی ای آزاد تھی اور وہ کوریا چلی گئی تھی۔

کوریا کی جنگ نے کئی پانسے بدلے۔ کئی رخ بدلے مگر ذی ای کی کوئی خبر نہ ملی۔ آزاد چائنا کی پہلی سالگرہ آئی اور چلی گئی۔ میں نے اس کے گاؤں کے اسکول میں کئی خط ڈالے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ روز اخبار دیکھتا رہا کیونکہ کوریا کی جنگ اب ذی ای کی ہی جنگ نہ تھی وہ اب میری بھی جنگ تھی۔

کل ملیٹر اخبار دیکھنے سے ذی ای کا پتہ چل گیا۔ کوریا کی لڑائی کے متعلق اس میں ایک تصویر چھپی تھی جس میں چند امریکن بہادر سپاہی پس منظر میں کھڑے ہیں اور اپنے سامنے انہوں نے کوریائی اور چینی سپاہیوں کے بارہ سر کاٹ کے اینٹوں پر رکھے تھے ان بارہ

سروں میں ایک سر ڈی ای کا تھا۔ بارہ کیا اگر ایک لاکھ سر بھی ہوں تو میں ڈی ای کا سر پہچان لیتا اس کے ہونٹ بند تھے۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ ڈی ای جو ڈی ای کی طرح اپنے وطن کی خاطر اور شاید بہت سے وطنوں کی خاطر جن سے اُسے دور کا بھی علاقہ نہ تھا شہید ہوگئی۔

پھر میرے سینے میں وہی دھڑکتی ابلتی ہوئی شام آئی جب چاروں طرف بارش ہو رہی تھی اور ہم دونوں ایک ساعت کے جزیرے میں ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھ میں لئے تنہا کھڑے تھے۔ ڈی ای تھا ایک دائم محبت کی دائم جوانی کے لئے مرمٹی۔ آج میرے ہاتھ میں اس کا کٹا ہوا سر تھا زندگی کی بند کلی کی طرح جس میں چاروں طرف خوشبو ہی خوشبو تھی۔ میں تجھ سے کیا کہوں، میری محبت کی آخری شام۔ کس طرح تیرے بالوں کو چوم کے کہوں۔ لے میرے پیار کا آخری سلام اور سو جا۔ اپنی عمیق نگاہیں میرے ملک کے لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی بخش دے اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لے اور سو جا۔ سو جا چین دیس کی محبوبہ۔ میرے گلاب۔ میرے کرسنتھم۔ میرے یاسمین۔ میرے موتیا کے پھولوں کی رانی۔ آج کی رات ہم سب پر بھاری ہے۔ ہم پر اس لئے کہ ہم تجھے موت کے منہ سے نہ بچا سکے۔ ایسی کاٹ کسی تلوار میں نہیں ہے جو ایشیا کی محبت کا کاٹ سکے۔ ڈائیک آدم خور اور امریکی آدم اور ان کے انگریزی۔ فرانسیسی اور ترکی غلام مل کر بھی ایشیا کی محبت کو ختم نہیں کر سکتے۔

آج میں اس چیز کو سمجھ گیا ہوں کہ تو میرے پاس پھر آئے گی جس طرح دو ہزار سال پہلے میں تیرے پاس گیا تھا۔ اسی طرح آج دو ہزار سال بعد تو چل کر میرے پاس آئے گی اور پھر تجھے اور مجھے اور دنیا کے عوام کو ہم سے کوئی جدا نہ کر سکے گا۔

اس چیز کو آج میں سمجھ گیا ہوں۔ اس لئے ڈی ای میں آج تیرا انتظار کرتا

ہوں ۔کیونکہ جب میں ذی ای کا انتظار کرتا ہوں تو میں روشنی کے ہنڈولے کا انتظار کرتا ہوں ۔ تو میں بہار کا انتظار کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔"

باپو کی واپسی

بس یہی کوئی ساڑھے پانچ بجے کا وقت ہوگا۔ میں شام کا اخبار پڑھ کر فارغ ہوا تھا
کسی نے دروازے پر دستک دی پیشتر اس کے کہ میں اٹھ کر دروازہ کھولتا۔ اندر کی چٹخنی
خود بخود کھل گئی اور وہ دروازہ کھول کر خود بخود اندر آگیا۔ لمبا تڑنگا وہی دبلا پتلا انسان تھا۔ اس
صرف ایک لنگوٹ پہن رکھا تھا۔ سینے پر تین گولیوں کے نشان تھے۔ وہ جلدی سے لمبے
لمبے ڈگ بھرتا ہوا میرے پاس آبیٹھا اور میرے پاس جھک کر کہنے لگا "کیا کر رہے تھے؟"

"حساب کر رہا تھا۔"

"کیسا حساب؟"

"یہی کہ پچھلے تین سالوں میں مزدوروں کے سینے پر کتنی بار گولی چلائی گئی؟"

وہ ہنس کے کہنے لگا۔ "میری تین گولیاں بھی شامل کر لو نا۔"

میں نے کہا۔ "وہ اس زمرے میں نہیں آتیں مگر دراصل ایک ہی پالیسی کا نتیجہ ہیں۔"

اس نے ہنس کر کہا۔ "میں وہ سب سمجھتا ہوں۔ اب تم جلدی سے اٹھ بیٹھو۔ میں

اپنا ملک دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔" آپ کے لئے تو سب دکھ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے۔ آپ کو ہمارے دکھوں سے اب کیا واسطہ؟"

وہ بولا۔" میں دراصل بڑے آرام سے لیٹا ہوا تھا کہ نیچے اس دنیا سے چیخ و پکار کا اتنا شور سنائی دیا کہ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں نے سوچا چل کے دیکھوں کیا ماجرا ہے۔ لوگ مجھے اس قدر کیوں یاد کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا۔" آپ کو غلط اطلاع ملی ہے معلوم ہوتا ہے سورگ کا محکمہ اطلاعات ٹھیک طور سے کام نہیں کر رہا۔ یہاں اب کسی کو بھی آپ کی یاد نہیں آتی۔ پہلے لوگ آپ کی سینما میں تصویر دیکھ کے تالیاں بجایا کرتے تھے۔ اب وزیروں کی تصویریں دیکھ دیکھ کر وہ شوق بھی ختم ہو گیا ہے۔"

اس نے کہا۔" مگر میں نے آہوں کا دھواں اٹھتا دیکھا تھا۔ بڑی بڑی ملوں کی چمنیوں سے۔۔۔۔"

میں نے کہا۔" وہ دھواں دراصل SMOKE SCREEN تھا دھویں کا سیاہ پردہ جس کی آڑ میں ملوں والے اپنی تجوریاں محفوظ کر رہے تھے وہ لوگ آپ کا نام لیتے ہیں۔ گلے مزدوروں کے کاٹتے ہیں جیسے خدا کا نام لے کے بکرے ذبح کئے جاتے ہیں۔"

وہ مسکرایا بولا۔" طعنے دینے کی تمہاری پرانی عادت ہے۔ وار دھا میں عرصہ ہوا میں نے تمہارا وہ مضمون پڑھا تھا۔" سوراج کے پچاس سال بعد" وہ مضمون پڑھ کے مجھے تم پر بہت غصہ آیا تھا۔"

وہ مضمون میں نے ۱۹۴۰ء میں لکھا تھا۔ ابھی سوراج کی پرچھائیں بھی نصیب نہ ہوئی تھی

لیکن ابھی تو سوراج کے تین سال ہی گذرے ہیں اور میرا مضمون - لیکن اب میں اپنی تعریف کیا کروں .... ؟"

ہم دونوں ہنسنے لگے - وہ بولا -" خیر اب تم جلدی سے اس کمرے سے باہر نکلو - میں ذرا اپنا ملک دیکھنا چاہتا ہوں ۔"

میں نے پوچھا" کیسے چلیں گے - بس کے انتظار میں ایک لمبی لائن میں کھڑا ہونا پڑے گا ۔"

وہ بولا -" زندگی میں تو لوگ میرے لئے ایک لمبی لائن لگاتے تھے انتظار میں - خیر، اب یوں ہی سہی - کمرے سے باہر نکل کر ہم لوگ ناکے پر بس کے انتظار میں کھڑے ہو گئے - ہمارے آگے ایک سندھی عورت کھڑی تھی - جس کے ہاتھ میں مٹی کے تیل کا پیپا تھا - وہ بڑے غصے سے کہہ رہی تھی -

" بس میں مٹی کے تیل کا پیپا نہیں لے جانے دیتے - تو میں اس کو کیسے راشن شاپ تک لے جاؤں گی ؟ راشن شاپ کی دکان یہاں سے دو میل دور ہے اور کیمپ میں بجلی بھی نہیں - اچھا رام راج ملا ہے -! ہم کراچی میں کیا بڑے تھے ؟ وہاں سے گھر بھی چھوڑا دکان بھی چھوڑی - یہاں کیمپ میں بے کار پڑے ہیں - اچھا سوراج ملا ہے - بس میں پیپا بھی نہیں رکھنے دیتے - اب سنا ہے - شرنارتھیوں کا راشن بھی بند ہونے والا ہے - اچھا رام راج ملا ہے - اب درخت اگاتے ہیں اور راشن بند کرتے ہیں ۔"

ایک مرہٹہ کلرک بولا :" ہاں مائی درخت اس لئے اگاتے ہیں کہ سارا ہندوستان جنگل بن جائے - پھر ہر پیڑ پر بندر اچھلیں گے اور صحیح معنوں میں رام راج قائم ہو جائے گا ۔

"ارے لو یہ بس بھی نکل گئی۔ یہ پانچویں بس بھی بھری ہوئی جارہی ہے اور جگہ ایک بھی خالی نہیں۔"

"ایسا کیوں ہے۔؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "یہاں شرنارتھیوں کا کیمپ ہے قریب میں۔ اس لئے آبادی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ بسیں وہی ہیں۔"

اس نے کہا۔ "تو چلو، پیدل چلیں۔ میں اپنا ملک ضرور دیکھوں گا۔"

بیس منٹ کے بعد ہم لوگ اسٹیشن پر پہنچے۔ میں نے پوچھا۔ "آپ سورگ سے تھرڈ کلاس میں آئے تھے کہ فرسٹ کلاس میں؟"

وہ بولا۔ "نہیں میں اپنی اسٹیشن ویگن میں آیا تھا۔ وہ تو میں نے واپس بھیج دی۔ اب تھرڈ ہی میں چلیں گے۔"

میں نے کہا۔ "مگر یہ اصلی تھرڈ ہے۔ یہاں پر۔ وہ تھرڈ نہیں جس میں آپ سفر کیا کرتے تھے جس میں بجلی کا پنکھا بھی لگا رہتا تھا۔ دونوں طرف کی سیٹیں بھی آپ کے لئے خالی رکھی رہتی تھیں اور لکڑی کے تختوں پر گدے بھی دھرے رہتے تھے۔ اب تو آپ کو اصلی جنتا کے تھرڈ میں سفر کرنا پڑے گا جہاں نہ پنکھے ہیں نہ گدے اور ہر سیٹ پر دس بارہ آدمی کندھے سے کندھا بھڑائے پسینہ میں شرابور بیٹھے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "تم تھرڈ ہی کا ٹکٹ لے لو۔ میں تم سے زیادہ اپنے ملک کی جنتا میں گھوما ہوں۔"

میں نے کہا۔ "سوچ لیجئے۔ آج کل کوئی بھی کانگریسی نیتا یا وزیر جنتا کے درجے میں سفر نہیں کرتا۔ دتو یا بھادے بھی سُنا ہے فرسٹ میں سفر کرتے ہیں اور فرسٹ میں کیسا ائیر کنڈیشنڈ

نہیں تو خالص چارٹرڈ ہوائی جہاز . . . . . "

اس نے کہا "اب تم بولتے ہی جاؤ گے یا میں کسی اور کا سہارا لے لوں ۔"

میں نے کہا ۔ اچھا اب یہ تو بتایئے کہ ٹکٹ کہاں کا لوں ۔ ؟"

"دلّی کا ۔"

دلّی پہنچ کر ہم نے سیدھا والسر ریگل لاج کا رخ کیا ۔ جہاں ملک کے "راشٹرپتی" رہتے ہیں راشٹرپتی کا اے ۔ ڈی ۔ سی بڑے تپاک سے ملا ۔

میں نے کہا ۔ "یہ میرے دوست ہیں ۔ پرانے کرم فرما ۔ یہ راشٹرپتی سے ملنے آئے ہیں ۔ "

اے ۔ ڈی ۔ سی تھا تو ہندوستانی اور بات بھی ہندوستانی میں کرتا تھا ۔ لیکن اس کا لب ولہجہ بالکل انگریزوں کا سا تھا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے حلق کے اندر لینوٹائپ کی مشین لگی ہوئی ہے جو ہر اچھے بھلے ہندوستانی جملے کو انگریزی ساخت میں ڈھالتی جا رہی ہے ۔

" بڑا افسوس ہائے ۔ راشٹرپتی آپ کو ناہیں مل سکتے ۔ دربار ہائے ۔ "

" ہائے ہائے ۔ " میں نے افسوس سے کہا ۔

" ہاں ہائے ۔ ہائے دربار ہائے ۔ "

" ہائے ہائے ۔ ہائے ۔ " میں نے پھر کہا ۔

اے ۔ ڈی ۔ سی کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا ۔ بولا ۔ " اور میں کیا سپاح نہیں بولتا ہاؤں ۔ ہائے دربار ہائے ۔ راشٹرپتی بڑے مصروف ہائیں دربار کے اندر ۔ میں مل سکتے ہائیں ۔ "

" ہائیں ۔ " میں نے کہا ۔ " دربار جانے کے لئے کوئی شرط ہائے ۔ "

وہ بولا: "یا تو پرنس ہونا مانگتا یا کونسل ہونا مانگتا۔ یا ممبر پارلیمنٹ ہونا مانگتا۔ یا کانگریس کا بڑا نیتا ہونا مانگتا۔۔۔۔"

میں نے اس سے کہا۔ "پھر تو آپ جا سکتے ہیں آخری زمرے میں۔"

اس نے اے۔ ڈی۔ سی سے بڑے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "تم راشٹرپتی کو میری یہ چٹ دے دو۔ وہ مجھے خود اندر بلا لیں گے۔"

اے۔ ڈی۔ سی چٹ لے کے اندر گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد چٹ لے کے واپس آگیا۔ بولا۔

"راشٹرپتی بولتا۔ تم سے کسی نے مذاق کیا۔ ایسے نام کا آدمی اندر کیسے آتا؟ وہ تو راج گھاٹ پر ہائے۔"

"ہائے، ہائے۔" میں نے کہا۔

"ہائے، ہائے، ہائے؟" اے ڈی۔ سی نے غصہ میں کہا۔ "ام تم کو بولتا ہائے ادھر راج گھاٹ پر ایسے آدمی کا فرمائے۔ ام نے خود دیکھا ہائے۔"

"ہائے۔ ہائے۔" میں نے کہا۔ "کیا خیال ہے چلیں گے راج گھاٹ پر یا یہاں پر ستیہ گرہ گرہ کرنے کا ارادہ ہے۔"

وہ ہنسا۔ بولا۔ "سوراج آنے کے بعد بھی والیسر یگل لاج کا تکلف وہی ہے۔ آداب و مراتب۔ نشست و برخاست کا انداز وہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے۔ سورگ میں رہ کر آپ نے اردو اچھی خاصی پڑھ لی ہے۔"

اس نے کہا۔ "اور کیا کریں؟ اردو ہندوستان سے گئی تو اب سورگ کی زبان ہو

گئی پیارے!"

پھر قدرے توقف کے بعد اے ڈی سی سے پوچھا۔"کیا میں ایک منٹ کے لئے اندر جا سکتا ہوں؟ یہاں میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔"

اے۔ ڈی۔ سی۔ نے کہا۔ ساری۔ آپ کی دعوت نائیں۔" پھر آپ ڈریس میں نائیں۔"

"کون سا ڈریس۔؟"

"انگریزی ڈریس چاہیئے یا پھر کالا اچکن ہونا۔"

اس نے غصے سے کہا۔" میں بکنگھم پیلیس تک اس ڈریس میں ہو کے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔" وہ سوراج سے پہلے کی بات ہے۔اب آپ بکنگھم پیلیس تو کیا کسی عدالت خفیفہ میں بھی یہ لباس پہن کر داخل نہیں ہو سکتے۔"

"چلو چلیں۔"

کہاں چلیں گے؟

"جواہر لال نہرو سے ملیں گے۔"

نہرو جی کے یہاں گئے تو معلوم ہوا وہ بمبئی میں ایک پاگل خانے کا افتتاح کرنے کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں سے سردار پٹیل کے ہاں گئے تو معلوم ہوا کہ وہ اکھل بھارتیہ مارواڑی چیمبرس آف کامرس کے اوگھاٹن کے لئے بیکانیر تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں سے مسٹر منشی کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ بھُساول اور متماڑ کے بیچ میں ایک کھجور کا پودا لگانے کے لئے چلے گئے ہیں۔ حسن اتفاق سے اسی روز جگ جیون رام کو "کوکا کولا کمپنی" کی طرف سے ناسک میں ایڈریس پیش کیا جا رہا تھا۔ اور شری مُیت قدوائی چیلا بیلی پٹم میں ایک

نیا ٹیلی فون ایکسچینج جاری کرنے کے لئے چلے گئے تھے۔ شری ہرے کرشن مہتاب ستیہ نارائن کی کتھا میں مصروف تھے۔ اور سردار بلدیو سنگھ جی کشمیر میں تھے اور مولانا ابوالکلام آزاد کلکتہ میں بیمار تھے اور شری راج گوپال اچاریہ کی امریکی سفیر کے ہاں دعوت تھی۔ یعنی پوری کی پوری کیبنٹ غائب تھی۔ میں نے کہا۔ "بتایئے اب کیا کیا جائے؟ کسی ڈپٹی منسٹر سے آپ ملیں گے۔" "یہ ڈپٹی منسٹر کیا ہوتا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے کہا: "یہ بڑے مزے کی چیز ہوتی ہے۔ کچھ منسٹر سے نیچی اور ڈپٹی سیکرٹری سے اونچی...... دو سیڑھیوں کے درمیان کی لکڑی سمجھئے۔"

اس نے ناک پر چشمہ درست کرتے ہوئے کہا: "میں نے بیچ کی لکڑی کو کبھی پسند نہیں کیا۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو آپ نہیں کہہ سکتے۔ آپ کا عدم تشدد بیچ کی لکڑی تھا یعنی انگریز کے خلاف عدم تشدد اور بمبئی میں مزدور پر گولی ہندی اکھوا ہندوستانی کیا بیچ کی لکڑی نہیں تھی؟ خلافت اور گئو سیوا۔ مسجد مندر اتحاد۔ بلونا ایوارڈ، اردن بیکیٹ۔ ماؤنٹ بیٹن تصفیہ۔ معلوم ہوتا ہے۔ نئی آزادی کا سارا ڈھانچہ اس بیچ کی لکڑی سے تیار کیا گیا تھا۔ یعنی انگریزوں کو ڈپٹی منسٹری سے۔ اس ڈپٹی منسٹری سے لوگ پٹے۔ عصمتیں لٹیں۔ ریوالور چلے۔ ایک، دو، تین۔ آپ کے سینے کے داغ آپ ہی کے سینے کے داغ ہیں۔ معاف کیجئے گا......"

اس نے کہا: "معلوم ہوتا ہے تمہارا دماغ پہلے سے زیادہ چل گیا ہے۔ اچھا اب چلو یہاں سے۔"

میں نے کہا: "لیفیوجی لوگوں کا کیمپ دیکھیں گے آپ؟ آیئے آپ کو بمبئی کے کوئی وارڈ

کیمپ میں لے چلوں جہاں پانچ سو آدمیوں کے لئے ایک پائخانہ ہے۔ ہٹلر کے جبری قید خانوں میں بھی اس سے زیادہ صفائی ہوتی ہوگی اور جب لوگوں نے اپنی تکلیفوں کو دور کرنے کے لئے احتجاج کیا۔ پُرامن۔ شانتی پورک جلوس نکالا تو ان پر گولی چلا دی گئی۔ آج کل گولی تو ایسے چلتی ہے جیسے چنا بھاڑ میں بھنتا ہے۔"

اس نے سوچ سوچ کر کہا۔ "چلو چمپارن چلیں۔ جہاں میں نے کسانوں کی تحریک سب سے پہلے شروع کی تھی۔"

میں نے پوچھا۔ "پھر تھرڈ کلاس کا ٹکٹ کٹاؤں؟ اپنی تو ہڈی پسلی ایک ہو گئی اس لکڑی کے تختے پر بیٹھے بیٹھے...."

وہ بولا۔ "ٹھہرو! سورگ سے اسٹیشن ویگن منگاتا ہوں۔ اور پھر مجھے بھوک بھی لگی ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو اپنی بکری بھی منگا لیجئے۔ یہاں دلّی میں بکری کا دودھ کہیں بھی نہ ملے گا۔ آپ کے بھگت بہت ملیں گے لیکن بکری پالنے والا کوئی نہیں ملے گا اب۔"

"آج کل لوگ کیا پالتے ہیں؟"

"جو امیر ہیں وہ پرمٹ اور الاٹ منٹ پالتے ہیں۔ جو چوٹے باز سیٹھ ہیں وہ امریکنوں کی دوستی پالتے ہیں۔ اور ڈالروں کے بوٹ چاٹتے ہیں جو رشوت خور افسر ہیں وہ سفید رنگ کی محبوبہ اور کالے رنگ کی "پیکارڈ" پالتے ہیں جو میرے ایسے بیوقوف ہیں۔ وہ آپ کا دماغ چاٹتے ہیں اور اپنا بھی دماغ چاٹتے ہیں۔

"اچھا آج میں تمہارا دماغ ٹھیک کر دونگا۔ ایسا اچھا بکری کا دودھ پلاؤں گا کہ تم بھی زندگی بھر دعا دیتے رہو گے۔"

"میں نے سنا ہے۔ یہاں آپ کی بکری کو بڑے بڑے مرغن کھانے کھلائے جاتے تھے۔ بادام کھلائے جاتے تھے اور وٹامن کے انجکشن لگتے تھے۔ بھلا سورگ میں وہ کیا کھاتی ہوگی۔؟"

"کچھ کھاتی نہیں ہے۔ خالی امرت پیتی ہے۔"

ہم دونوں ہنسنے لگے۔ اتنے میں سورگ سے اسٹیشن ویگن آگئی اور ہم دونوں چمپارن پہنچ گئے۔

جھبو نے مجھ سے کہا۔" ایک ایسا آدمی ہمارے ضلع میں آیا تھا جیسا تمہارا ساتھی ہے بالکل اسی طرح مسکراتا تھا۔ جب مجھے دو سال کی قید ہوئی تھی۔ جب میں جوان تھا۔ جب مجھے جیل جانا اچھا معلوم ہوتا تھا۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

" اس لئے کہ لگان بہت زیادہ تھا۔ زمیندار بیگار لیتا تھا۔ انگریز کا افسر بہت ظلم کرتا تھا اور جس طرح تمہارا ساتھی ہے اسی طرح کی شکل وصورت کے اُس آدمی پر میں نے اور میرے گاؤں والوں نے بھروسہ کیا تھا۔ اور اس کے کہنے پر چل کے جیل کاٹی تھی۔ چکی پیسی تھی۔ گھر لٹوایا تھا۔ زمین ضبط کروائی تھی۔"

"اب کیا حال ہے؟" میرے ساتھی نے پوچھا۔" اب تو مزے ہی مزے ہوں گے۔ اب تو اپنا راج ہے۔"

"سو بھئی، وہ تو ٹھیک ہے۔" جھبو نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا۔" اپنا راج تو ہے پر اپنی زمین نہیں ہے۔ زمین تو وہی زمیندار کی ہے اور اس کا ظلم اسی طرح کا ہے اور اس کے اوپر بڑی سرکار ہے اور وہ بھی ویسی ہے۔ جیسے آزادی کے پہلے کی تھی

خالی ٹوپی بدلی ہے اور کچھ نہیں بدلا۔ میرے بھائی پہلے انگریزی ٹوپی تھی۔ اب گاندھی ٹوپی ہے اور پچھلے مہینے سے قحط پڑ گیا ہے۔ پر سُنا ہے۔ دہلی کا وزیر نہیں مانتا۔ کہتا ہے بہار میں قحط کہاں؟ ابھی کل ہی ہمارے گاؤں کا کمہار مر گیا۔ بھوک سے مر گیا۔ مگر ہمارا وزیر کا ہے کو مانے گا؟ سب مر جائیں گے تو بھی قحط نہیں پڑے گا۔ اوپر سے تحصیل دار کہتا ہے درخت اگاؤ۔ ارے بھائی۔ اس زمین میں تو اب اتنے سے چاول نہیں ہوتے۔ اتنا بڑا درخت کہاں سے اُگے گا بھے تا انگریزوں والی ہٹ دھرمی.....!"

"تم ستیہ گرہ کیوں نہیں کرتے۔" اس نے پوچھا۔

جھبو نے آہستہ سے اِدھر اُدھر چاروں طرف دیکھا۔ پھر سرگوشی میں بولا۔ آہستہ سے بات کرو۔ کہیں کسی نے سن لیا تو گولی چل جائے گی۔ بھائی چار دن جندگانی کے ہیں جیسے تیسے کاٹ لیں گے مگر رام بھلا کرے۔ اس لنگوٹی والے کا۔ یار نے کیسا چکما دیا خود اس کے بھائی بند چیلے چانٹے تو مزے کر رہے ہیں۔ یہاں جھبو اسی طرح لڑ رہا ہے۔ اچھا رام راج آیا...... اس سے تو راون راج ہی اچھا تھا" اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک اٹھے۔

میں نے کہا۔" جھبو سے اور کچھ پوچھنا ہے تو رک جائیں۔ نہیں تو کہیں اور چلیں۔"

اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔" نہیں۔ اب یہاں سے چلو۔"

میں نے پوچھا۔" تو اب کہاں چلیں؟ سالم جیل میں؟ جہاں اکیس کمیونسٹ قیدی گولی سے مار دیئے گئے تھے۔"

"نہیں۔!"

میں نے پوچھا۔" اچھا تو ٹرا وندرم کا وہ ذبح گھر آپ دیکھیں گے جہاں بکریاں ذبح

ہوتی ہیں۔ جس کا ٹھیکہ ایک کانگریسی نے لے رکھا ہے۔؟"

"نہیں، نہیں۔!"

"اچھا تو آچاریہ کرپلانی سے ہی مل لیجیئے وہ آپ کو بتائیں گے کہ وزارتیں کس طرح بنتی ہیں۔ کس طرح بگڑتی ہیں۔ کس طرح سنورتی ہیں۔؟"

"نہیں۔! نہیں۔! نہیں۔!"

"اچھا تو پھر کشمیر چلیئے جہاں ہندوستانی اور پاکستانی فوجیں دو بدو ستیزہ گرہ کر رہی ہیں۔"

"نہیں۔ بھائی۔ میں اپنے دیس کی سچی حالت دیکھنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ آج میرا دیس ہے۔"

"یہ تو آپ کو سرکاری قیمتوں سے پتہ چل جائے گا جب آپ مرے تھے اس وقت سے آج تک قیمتوں کی شرح میں تقریباً تین سو گنا اضافہ ہو گیا ہے۔ پہلے چینی نہیں ملتی تھی۔ اب گڑ بھی بلیک مارکیٹ میں پہنچ گیا ہے اور کھدر بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ گڑ بلیک مارکیٹ کے اندر ہوتا ہے اور کھدر بلیک مارکیٹ کے اوپر منڈھا ہوتا ہے۔ جنتا کے ہاتھ میں خالی چرخہ ہی چرخہ ہے۔!"

"مجھے تو تمہاری باتوں پر نہ پہلے کبھی بھروسہ تھا نہ اب ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "میں خود کسی سے دریافت کر لوں گا۔ چلو بمبئی چلیں۔ وہاں بہت سی باتوں کا پتہ چل جائے گا۔ روئی کا بھاؤ تو مجھے چمپارن سے معلوم ہو گیا۔ اب کپڑے کا بھاؤ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"کپڑے کی بھی سرکاری دو قسمیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "ایک امیر آدمی کے کپڑے کا بھاؤ

ہے۔ اس کی الگ شرح ہے اور ایک غریب آدمی کے کپڑے کا پھاڑ ہے۔ اس کی الگ شرح ہے جو پچھلے دو سال سے یہی چلی آ رہی ہے۔"

"یعنی ۔؟"

"یعنی وہی لنگوٹی ۔ پھاڑ کچھ ہی کیوں نہ ہو شرح وہی ہے چاہے رام راج ہو یا راون راج ہو۔ وہی ایک لنگوٹی ہے غریب کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔"

"پہلے تم اتنے جھکی نہیں تھے ۔ کیا بات ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"پہلے قیمتوں کی شرح اتنی بڑھی نہ تھی۔" میں نے جواب دیا۔ "پہلے میں حنائی انگلیوں اور گلاب کی پوروں کا خواب دیکھتا تھا۔ پھر شرح ایک سو سے دو، دو سو سے تین سو ۔ تین سو سے چار سو گنی ہو گئی اور یکایک حنائی انگلیاں مٹی میں سن گئیں اور گلاب کی پوریں مرجھا کر مٹی میں مل گئیں اور جس سے میں محبت کرتا تھا ۔ وہ میری بے کاری سے اکتا کر ایک سٹے باز کے پاس چلی گئی اور میری محبت کے بدن پر صرف ایک لنگوٹی چھوڑ گئی۔"

"بکری کا دودھ پئیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"آپ کی سورگ کی بکری کا دودھ نہیں پی سکوں گا۔ امرت پینے والی بکری کا دودھ پی کر میں ہمیشہ زندہ نہیں رہنا چاہتا۔"

"کیوں ۔؟"

"ہمیشہ زندہ رہنا آنے والے بچوں کے لئے برا ہے ۔ یہ اچھا ہے کہ ہم لوگ تھوڑی دیر کے لئے زندہ رہیں، مر جائیں اور پھر دنیا ہمیں ہمیشہ کے لئے بھول جائے ۔"

"جیسے ؟"

"جیسے پرانے پھول کھل کر، مہک کر، لہک کر مرجھا جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ نئے

پھول آتے ہیں۔"

اتنے میں اسٹیشن وگین آگئی اور ہم لوگ بمبئی کے بھنڈی بازار میں پہنچ گئے۔

کمال نے کہا۔"میں نے آپ کو پہچان لیا۔"

"کیسے۔؟" اس نے پوچھا۔

"آپ احمد آباد میں سارا بھائی کے ہاں آتے رہتے تھے اور میں سارا بھائی کے مل میں نوکر تھا۔"

آج کل کہاں ہو۔؟"

"یہاں سیسون مل میں کام کرتا ہوں۔"

"انگریزوں کی مل ابھی تک یہاں ہے۔"

"انگریزوں کی کون سی چیز یہاں سے گئی ہے۔ انگریزی تک یہاں موجود ہے۔"

"کپڑے کا کیا بھاؤ۔؟

"مجھے معلوم نہیں"۔ کمال نے کہا۔" دو سال سے کوئی کپڑا نہیں خریدا۔"

"کیوں؟"

"کھانے، کھولی، بیماری، بجلی، پانی اور بیڑی کے بعد دام نہیں بچتے۔"

"تمہاری بیوی کہاں ہے۔؟"

"پاکستان میں۔"

"کیوں۔؟"

"جب فساد ہوا تھا تو اماں کے ساتھ چلی گئی۔ میں بھی چلا جاتا مگر آپ نے میری جان بچالی۔

"اب تم بیوی کو واپس کیوں نہیں بلا لیتے؟"

"کیسے بلا لوں؟ خرچ نہیں ہے۔ مزدور ہڑتال پر ہیں۔"

"ہڑتال کیوں کرتے ہیں؟"

"بونس نہیں ملا۔"

"بونس؟ کاہے کا ....؟"

"مل مالکوں نے کروڑوں روپیہ کمایا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا۔ ایک دفعہ آپ نے کنٹرول اٹھوا دیا تھا۔ چند دنوں میں مل مالکوں نے کروڑوں روپے کا ہیر پھیر کر لیا۔"

"ہاں۔ وہ میری غلطی تھی۔"

"غلطی آپ کی تھی مزا ہمیں آ رہا ہے۔ چیزوں کے دام بڑھتے جا رہے ہیں۔ جوں جوں سوراج کی عمر لمبی ہوتی جا رہی ہے۔"

"تم آخر کیا چاہتے ہو۔ بونس؟"

کمال نے کہا۔ "نہیں میں اپنی حکومت چاہتا ہوں۔ میں سارے کارخانے خود چلاؤں گا۔ سارے کھیت خود بوؤں گا۔ ساری محنت خود کروں گا۔ سارا پھل خود کھاؤں گا۔"

"پھر تو گولی چلے گی۔" اس نے ہنس کے کہا۔

کمال بولا۔ "مجھے معلوم ہے۔ مگر کیا آپ ہمیں اس لنگوٹی میں دیکھ کے خوش ہیں؟ اگر ایسا ہے تو آپ نے ہماری جان کیوں بچائی تھی؟ کیا کڑھ کڑھ کر مرنے کے لئے ....؟"

اس نے کہا۔ "میں نے خود زندگی بھر لنگوٹی پہنی ہے۔"

"وہ تو مسیح کی صلیب تھی۔" کمال نے کہا۔ "صلیب زندگی میں ایک بار ملتی ہے اور پھر قوم کی قوم زندہ ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ صلیب کیسی تھی کہ دار پر جھولنے کے بعد بھی

قوم کی حالت نہ بدلی - اس تن پر یہ لنگوٹی کی لنگوٹی رہی ۔۔۔"

"قناعت کرنا سیکھو کمال ۔"

کمال نے مسکرا کر کہا ۔" اچھا چلئے ۔ خالی بونس ہی دلوایئے ۔ لایئے ہاتھ ۔

وہ ہنسنے لگا ۔ بولا ۔" تمہاری ہڑتال سے کوئی اثر نہیں پڑا ۔۔۔"

" گولی دو بارہ چل چکی ہے ۔ آگے بھی شاید چلے گی ۔ گھر کے برتن تک بک گئے ہیں ۔ احمد آباد کے مل مالک بہت خوش ہیں کیونکہ بمبئی کی ملیں بند ہیں اور احمد آباد کی ملیں چل رہی ہیں ۔ اس لئے گویا جو ہمارے لئے عذاب ہے وہ امیر کے لئے ثواب ہے ۔"

"میرے سوراج میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں ۔"

" تو پھر وہ چڑیا گھر سرکس کا گھاٹ ہوگا ۔ جنگل کا گھاٹ نہیں ہو سکتا ۔"

" میرے سوراج میں امیر اور غریب دونوں برابر ہیں ۔"

" تو پھر وہ سرمایہ پرستوں کا سوراج ہوگا ۔ غریبوں کا سوراج نہیں ہو سکتا ۔"

" تم دوسرے کا حق چھیننا چاہتے ہو ۔"

" اگر دوسرے کے حق میں پورا محل ہے اور میرے لئے صرف ایک کھولی ہے اگر دوسرے کے حق میں لندن کا سفر ہے اور میری جیب میں چائے پینے کے لئے پیسے بھی نہیں ہیں ۔ اگر دوسرے کے حق میں کالج کی تعلیم اور میرے لئے ابجد کے دو حروف بھی نہیں ہیں تو میں دوسرے کا حق ضرور چھینوں گا ۔"

معلوم ہوتا ہے تم پھر بھوکے ہو ۔ کمال ۔"

" ہاں ، میں نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا ہے ۔ میں ڈیڑھ مہینے سے ہڑتال پر ہوں کمال نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا ۔

"تو آؤ تمہیں بکری کا دودھ پلائیں۔"

کمال ہنسا۔ بولا۔ "بھوک زوروں کی لگی ہے بکری کے دودھ سے کیا ہوگا۔ وہ سامنے نورا کبابیئے کی دکان ہے۔ وہیں سے چل کے کچھ دے دیجیئے نا۔"

اتنے میں اسٹیشن ویگن آگئی اور ہم کٹڑے پہ چلے گئے۔

کٹڑے میں امن کا جلوس نکل رہا تھا۔ دیہاتی، کلرکوں کے لڑکے اور مدرس، غریب کلرک اور بے کار نوجوان اور دو تین غریب جرنلسٹ سب ہاتھوں میں جھنڈے لئے گزر رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔

ہم امن چاہتے ہیں۔

دنیا میں شانتی کا راج ہو!

تیسری جنگ بند ہو!

جو پہلے ایٹم بم گرائے گا۔ وہ جنتا کا دشمن کہلائے گا۔

ہم بھی اس جلوس میں شامل ہو گئے۔ اس نے مسکرا کر قریب کے ایک آدمی سے پوچھا "تمہیں امن کیوں چاہیئے۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"سیارائے۔"

"کیا تنخواہ پاتے ہو؟"

"بائیس روپے۔"

"بائیس روپے میں کیسے کام چلتا ہوگا۔؟"

"بھوکا رہنا پڑتا ہے۔"

"پھر بھی شانتی چاہتے ہو ؟"

سُبارائے نے رک کے کہا۔ "شانتی ...... ؟ میں تمہارا سوال سمجھ گیا۔ شانتی مجھے پھر بھی چاہیئے۔ ایک تو میرے اسکول کے بچے ہیں مجھے انہیں پڑھاتے ہوئے بڑی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ پھر میری بوڑھی ماں ہے۔ وہ شاید آٹھ دس سال اور جئے گی۔ جتنی محنت سے اس نے مجھے پڑھایا ہے۔ اتنی محنت سے اگر اسے تھوڑا سا آرام بھی نہ دے سکا تو لعنت ہے میری زندگی پر۔ اس لئے مجھے امن چاہیئے اور ماں کس کو پیاری نہیں معلوم ہوتی ...... پھر میں شاید کبھی کسی لڑکی سے محبت بھی کروں گا ...... اب تم سمجھ گئے مجھے امن کیوں چاہیئے ؟

وہ آگے بڑھ گیا۔ آگے آگے ایک کسان نعرے لگا رہا تھا۔ اس نے اس سے پوچھا

"تجھے لگان، مالیہ، زمینداره اور بیاج دے کر کیا بچتا ہے ؟"

"ایک وقت کا کھانا اور اگر فصل اچھی نہ ہو تو وہ بھی نہیں بچتا۔"

"پھر بھی تجھے امن چاہیئے۔ ؟"

"ہاں" کسان نے رُک رُک کے کہا۔ "کبھی تو زمین پر بھی بہار آئے گی۔ میں اس بہار کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

"یہ لوگ کتنے اچھے ہیں۔" اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ "میں ان کے ساتھ آخر تک جلوس میں جاؤں گا۔ میں ان کے جلسے میں تقریر بھی کروں گا۔ اگر یہ لوگ مجھے اجازت دیں گے۔"

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔" میں نے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہا۔ "یہ ہندوستان کے نئے لوگ ہیں۔" اسی یقین اور اعتماد کے ساتھ میں نے جلسے میں اس کا

تعارف ایک پرانے کانگریسی کی حیثیت سے کرایا۔ میں نے اس کا نام نہیں بتایا۔ مناسب نہیں سمجھا۔

اس نے کہا۔ " ہندوستان میں امن کی تحریک بہت پرانی ہے ۔ یہاں جنگجوؤں کی تحریک بھی بہت پرانی ہے ۔ لیکن جب جنگجو آتے رہے ۔ پُرامن لوگ پُرامن جتھا کے سہارے ان کا مقابلہ کرتے رہے ۔ امن کی قوت ہماری تاریخ میں ہر صفحے پر چمکتی نظر آتی ہے ۔ گوتم اشوک اکبر، کبیر نانک، چشتی . . . . امن کی تو ہندوستان میں روح ہے ۔ اس کا دھرم ہے ۔ اس کے کلچر کا خمیر ہے ۔ اس کے لئے اچھے لوگوں نے اپنی زندگیاں قربان کر دی ہیں ۔ وہ خالی وعظ ہی نہیں کرتے رہے ۔ اس کے لئے مر جاتے رہے ۔ آج بھی جب دنیا کو امن کی ضرورت ہے ۔ ہندوستان کے لوگ ایک آواز ہو کر امن کی تحریک میں ساری دنیا کی جنتا کا ساتھ دیں گے ۔ اور میں اپنی طرف سے اپنی زندگی پیش کرتا ہوں کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ . . . . . "

اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا ۔ کیوں کہ پولیس نے مجمع کو خلاف قانون قرار دے کر لاٹھی چلا دی ۔ پھر گولی ۔ کسی کے لاٹھی لگی ۔ کسی کے گولی ۔ اس کے پھر گولی لگی ۔ ایک نہیں ——— دو نہیں ——— تین گولیاں یکے بعد دیگرے اس کے سینے پر لگیں اور ——— وہ "ہائے رام" کہتا ہوا پلیٹ فارم سے فرش پر جا گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا ۔

تھانے میں تفتیش کے موقع پر مجھے بلایا گیا ۔ پولیس انسپکٹر ——— نے پوچھا ۔

"تم اس آدمی کو پہچانتے ہو ؟"

یں نے کہا اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ اس کا نام داس کرم چند گاندھی ہے۔ یہ ہماری قوم کا سردار تھا۔ آج اسے دوسری بار قتل کیا گیا ہے۔"

بارود اور چیری کے پھول

سیول جل رہا تھا۔

اینٹوں کے ڈھیر کے پیچھے لائیم نے لکی سٹرائیک کا ایک سگریٹ سلگایا۔ اور اپنی رائفل کے سہارے کھڑے ہو کر اپنے چاروں طرف دیکھا۔

چاروں طرف شہر کی گری ہوئی عمارتوں کے ملبے پڑے تھے۔ کہیں کہیں کنکریٹ ادھ جلی عمارتیں باقی رہ گئی تھیں۔ شہر کے بیچوں بیچ ہزاروں ٹن بموں کی مار سے ہوائی جہازوں نے امریکی فوج کے لئے ایک چھوٹا سا راستہ بنایا تھا کہ امریکی فوج شہر کے مشرق سے مغرب تک جا سکے لیکن جب اس پر بھی سیول فتح نہ ہوا تو پھر ہزاروں ٹن کی ان گنت بمباری سے ایک دوسرا دوسرا راستہ بنایا گیا۔ جو شمال سے جنوب تک رستہ صاف کرتا تھا۔ اب شہر کو چار ٹکڑیوں میں تقسیم کر کے گھیرے میں لے لیا گیا۔ پھر بھی قدم قدم پر لڑائی ہوئی یہ کم بخت کوریائی سپاہی جب تک مرتے نہیں لڑتے ہی جاتے ہیں۔!

لائیم نے ایک زور کا کش اندر کھینچ کر سوچا۔ اپنے چاروں طرف دیکھا اور پھر اُسے

اپنے چاروں طرف ادھ جلی عمارتیں نظر آئیں - چاروں طرف جلنے کے ڈھیر پانی کے نل پھٹے ہوئے - بجلی کے کھمبے سڑکوں پر گرے ہوئے - جگہ جگہ کوریائی اور امریکی سپاہیوں کی لاشوں کے ڈھیر، بارود کی کانچ بموں کے گہرے گڑھے اور ہوا میں نائٹریٹ اور فاسفورس کی تیز اور کڑوی بدبو اور چاروں طرف آنکھوں کو جلانے والا سیاہ دھواں ...... یہ دھواں غبار کی طرح سارے شہر پر چھایا ہوا تھا - لائیم کھانسنے لگا اور پھر کھانستے کھانستے گالی بکتے ہوئے مڑکر اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔

"بڑی مصیبت کی جنگ تھی - یہ جوس بڑی حرامزادی، سفلی شیطانی، نکمی، خدا ماری جنگ تھی جوس -"

جوس، جس کا اصلی نام نہ لائیم جوس تھا نہ اور منیج جوس، نہ کوکو لا جوس بلکہ صرف جونز لیکن جسے اس کے ساتھی اس لئے جوس کہتے تھے کہ اس کا چہرہ دیکھنے میں بڑا گول مٹول، معصوم اور پلپلا سا تھا - جلد اتنی نازک کہ گمان ہوتا تھا، اس میں ذرا سی سوئی چبھو دی تو رس کی دھار بہہ نکلے گی - بالوں کی رنگت پلاٹینم کی طرح تھی - اور بھویں اور پلکیں تو بالکل سفید تھیں - جس میں سے اس کی چھوٹی چھوٹی اور ہری آنکھیں مرغی کے بچے کی طرح چمکتی تھیں - اس وقت اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا - جنگ بھی مصیبت کی تھی خون بھی بہت بہا لیکن آخر میں آج ہماری فتح ہوئی -"

"اس میں کوئی شک نہیں -" لائیم نے فتح مندی کی نظروں سے سامنے کی کنکریٹ عمارت کی طرف دیکھا - اس عمارت کی آدھی چھت اڑ چکی تھی - آدھی باقی تھی - چھت کے اوپر امریکی جھنڈا لہرا رہا تھا - کھڑکیاں، دروازے سب ٹوٹے ہوئے تھے - چاروں طرف سڑک کے اوپر گلاس کی کرچیاں ریزہ ریزہ ہو کے پڑی تھیں - لائیم نے سگریٹ کا دوسرا

کش لیا۔ اور اتنے زور سے اندر کھینچا کہ سگریٹ جل کے آدھا ہو گیا اور اس کی راکھ اُڑ کے لائیم کی آنکھوں میں جا پڑی اور وہ گالیاں دیتے ہوئے اپنی آنکھیں ملنے لگا۔ خدا غارت کرے ان سب بلڈی ایشیائیوں کو۔ کہاں آ کے دے مارا! ۔ میں اچھا بھلا اپنے سن ستائی میں انشورنس ایجنٹ تھا۔"

"کون سی کمپنی کے۔؟"

"دی گریٹ فیڈرل۔ امریکن انشورنس کارپوریشن انکارپوریٹیڈ ......"

"اب بھی اس کے ایجنٹ ہو؟" جوس نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں جھپکا کے دور سامنے کی ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ دیکھو۔"

لائیم نے دیکھا تو اسے مخالف سمت کی ادھ جلی عمارت پر وہی گریٹ فیڈرل امریکن انشورنس کارپوریشن کا نام جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا نظر آیا۔ اس عمارت کے اوپر بھی امریکی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ اور عمارت کے باہر امریکی سپاہیوں کی ایک گاروستالین اور کم ارسلین کی تصویریں پھاڑنے میں مصروف تھی۔ ارے سچ مچ یہ تو وہی ہے مگر میری امریکن کمپنی کیسے آگئی۔؟

جوس نے مسکرا کر کہا۔" اس کے ساتھ میں اور نام بھی ہیں۔ غور سے دیکھو۔"

لائیم ادھ جلے نام پڑھنے لگا۔ اکیلی فورنیا۔ چانول گدام۔ ایجنٹ ملیس ...... اینڈ فلپ ..... کوریا کول اینڈ آئل ریفائن ریز انکارپوریٹڈ .... نیو یارک ہیرلڈ ٹریبون ...... لائف اینڈ ٹائم ...... رائس ایکسپورٹ اینڈ کوکو کولا امپورٹ کمپنی انکارپوریٹڈ شنگاگو۔

لائیم خوشی سے چلایا۔" ارے یہ تو سب اپنے نام ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے امریکہ

پہلے ہی سے کوریا میں موجود تھا۔"

جوس نے کہا۔" اس میں کیا شک ہے ہم پہلے ہی موجود تھے اور یہاں آج بھی موجود ہیں اور یہاں سے کبھی نہیں جائیں گے۔ چاہے شیطان کمیونسٹ کچھ ہی کیوں نہ کہیں۔"

"بالکل۔" لائیم نے بڑی مضبوطی سے کہا اور اس کے جبڑے زور سے تن گئے۔
لائیم تارڈ کی طرح لیا امریکی تھا اور اپنی ماں کی طرف سے آدھا آئرش، آدھا جرمن تھا اور باپ کی طرف سے ایک چوتھائی حبشی۔ دو چوتھائی میکسیکی۔ ایک بٹا آٹھ جپسی اور فرانسیسی تھا۔ یعنی وہ بالکل سو فیصدی امریکی تھا۔ جو سفید رنگ کی برتری یا حبشیوں کی لن چنگ اور ٹرومین کے ایٹم بم پر ایمان رکھتا تھا۔ اوپر سے وہ جتنا لمبا تھا۔ اندر سے اتنا ہی چھوٹا تھا۔ اوپر سے وہ جتنا بہادر تھا۔ اندر سے اتنا ہی بزدل، کمینہ، ظالم اور بے وفا تھا سخت ڈیوٹی لینے سے ہمیشہ گھبراتا تھا۔ لیکن جب کسی مورچے پر فتح ہو جاتی تو فتح کا سہرا لینے کے لئے سب سے آگے ہوتا۔ جب ہی تو اب تک زندہ تھا۔ اس کی بٹالین کے باقی نوجوان امریکی کب کے سیول کے محاذ پر ختم ہو چکے تھے۔ اب صرف جوس اور لائیم باقی رہ گئے تھے۔ جوس بھی اوپر سے بڑا معصوم دکھائی دیتا تھا۔ لیکن اندر سے بالکل لائیم کی طرح تھا اس لئے لائیم اور جوس میں گاڑی چھنتی تھی۔ بلکہ انہیں ہمیشہ اکٹھے دیکھ کر ان کے دوسرے ساتھی اکثر کہا کرتے تھے۔" وہ دیکھو لائیم جوس کی لوٹل آ رہی ہے۔"

یکایک سامنے کی عمارت پر پہلی منزل کے برآمدے میں دو امریکی سپاہی نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا کپڑا تھا۔ جسے انہوں نے برآمدے کے باہر لٹکا دیا تاکہ سڑک پر آتے جاتے ہر امریکی سپاہی کی نظر اس کپڑے پر پڑ سکے۔ اس نیلے

کپڑے پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا۔

عظیم الشان نیلام

آیئے اور خریدیئے

اور پھر برآمدے میں بہت سے امریکی سپاہیوں کی صورتیں نمودار ہوئیں۔ وہ سب لوگ پی رہے تھے۔ گا رہے تھے اور زور زور سے چلا رہے تھے۔" شاندار نیلام ہے کھلا بازار عام ہے۔ آؤ خریدو ایسا مال پھر کبھی نہیں ملے گا۔"

لائیم اور جوس اسے دیکھتے ہی عمارت کے اندر بھاگے اور کھٹا کھٹ سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل پر پہنچ گئے۔ اندر جاکر انہوں نے دیکھا کہ ایک بہت بڑا ہال ہے۔ جس کے دروازے پر نصف ڈالر کا ایک ٹکٹ ملتا ہے جسے لے کر اندر جانا پڑتا ہے۔ دو ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوئے۔ اندر ان کی طرح ہی دو تین سو امریکی سپاہی ایک اونچی اسٹیج کے اردگرد جمع تھے۔ یہ سٹیج ہال کے مغربی کونے میں تھی اور ایک لاںبے آدمی کے قد سے بہت اونچی تھی۔ اس اسٹیج کے ایک طرف دروازہ تھا اور دوسری طرف نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اسٹیج کے اوپر رسوں کا ایک جنگلہ باندھا گیا تھا۔ اور اسٹیج بالکل خالی پڑی تھی۔ ہال سپاہی چاروں طرف ہال میں کھچا کھچ بھرے ہوئے چلا رہے تھے۔ گا رہے تھے۔ گالیاں بک رہے تھے۔ اور شراب کی بوتلیں منہ سے لگائے غٹاغٹ پی رہے تھے۔

لائیم نے جوس اور جوس نے لائیم کی طرف حیرت سے دیکھا۔ پھر جوس نے اپنے قریب کھڑے ہوئے ایک سپاہی سے پوچھا۔

"یہ کیا تماشہ ہے باکسنگ؟"

پستہ قد امریکی نے جس کے سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ سر ہلا کے کہا۔

"نائیں" وہ بے حد پٹے ہوئے تھے۔

لائیم نے پوچھا۔ "تو پھر کیا ہے تھیٹر؟"

"نائیں۔"

"تو پھر کیا ہے ناچ؟"

"نائیں۔" پستہ قد امریکی نے ایک برقی کھلونے کی طرح بالکل پہلی سی تال اور لے پر اپنا سر ہلا کے کہا۔

لائیم نے پستہ قد امریکی کو جھنجھوڑا اور غصّہ سے پوچھا۔ "تو پھر کیا ہے؟"

"دیکھتے نہیں ہو نیلام ہے۔"

"کس چیز کا نیلام ہے۔؟"

"مجھے کیا معلوم۔ میں بھی تمہاری طرح نصف ڈالر خرچ کرکے اندر آیا ہوں۔ یہاں اسٹیج خالی پڑی ہے۔ مجھے تو سب بلڈی مذاق معلوم ہوتا ہے۔ سب خونی خونی، اسٹیج خونی آدھا ڈالر۔ خونی جنگ۔ سب بلڈی خونی۔ مجھے چھوڑ دو۔ میں تھکا ہوا ہوں۔"

یکایک ہال میں ایک غلغلہ بپا ہوا۔ ایک آدمی نیلام گھر کے مینیجر کا شالی لباس پہنے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوا اور گھنٹی بجا کے بولا۔ ایٹم بم کے بیٹو! آج ہم نے سیئول کے شہر پر فتح پائی ہے۔ گویا سارے کوریا پر فتح پائی ہے۔ اس خوشی میں یہ نیلام منعقد کیا جاتا ہے۔ ایسا نیلام آپ نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اب دیکھو اپنی پاکٹ خالی کردو...... ایٹم بم کے بیٹو!"

اتنا کہہ کے اس نے زور سے گھنٹی بجائی اور اسٹیج کے مغربی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی مغربی دروازہ کھلا اور اس کے اندر سے کوریائی لڑکیوں کی

ایک قطار سٹیج پر داخل ہوئی - ایک لمحے کے لئے ہال میں سناٹا چھا گیا کیونکہ لڑکیاں بالکل ننگی تھیں - جسم ننگے .... نگاہیں نیچی - بال کھلے ، برہنہ پا - ہاتھ پشت پر رسّوں سے بندھے ہوئے تاکہ یہ کورِیائی لڑکیاں کسی طرح بھی اپنی برہنگی نہ چھپا سکیں نہ اپنے منہ ہاتھوں میں چھپا کر، نہ اپنے بال سینے پر لہرا کر آج تن ڈھانکنے کی کوئی صورت نہ تھی - اس لئے وہ گردنیں ننگی تھیں - جہاں محبت نے چیری کے شگوفوں کے ہار پہنائے تھے - وہ چھاتیاں ننگی تھیں جہاں بے زبان بچوں نے مامتا کا رس پیا تھا - وہ کوکھ ننگی تھی جس کے اندر بیج ہوتا ہے بیج کے اندر شگوفہ ہوتا ہے - شگوفے کے اندر پھول ہوتا ہے اور پھول کے اندر پھر بیج ہوتا ہے - ایسی خوب صورت تخلیق کو امریکی بہادر سپاہیوں نے ننگا کر دیا تھا - اور یہ رسّوں سے بندھی ہوئی ایشائی روح اپنی صدیوں کی بے حرمتی کے داغ اپنے سینے پر لئے ہوئے اجنبی فاتحوں کے درمیان گھوم رہی تھی - یہ نیلام گھر آج ہی نہیں آج سے بہت عرصہ پہلے سجا تھا - جہاں جہاں ظلم نے ڈیرے ڈالے تھے - چنگیز کے خیموں میں جنوبی امریکہ کی ریاستوں نے، یونان کی منڈیوں میں - روم کے ایمفی تھیٹروں میں، جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں، ہٹلر کی جیلوں میں جہاں جہاں ظلم نے ڈیرے ڈالے تھے وہاں یہ معصوم روح ننگی کی گئی تھی برہنہ پا، سینہ صد چاک خاک و خون میں غلطاں، اپنی پلکوں کے اندر عصمت و عفت کی ہزار ویرانیاں چھپائے - اس نے حیرت سے ان نیلام گھروں کو دیکھا تھا اور ان کی وحشی دیواروں سے پوچھا تھا کیا انسان لئے پیدا ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کو ننگا کرے - بچوں کو جلائے اور بڈھوں کے سینوں میں سنگین گھونپے یا اس لئے کہ وہ ایک پل بنائے، ایک کتاب لکھے - ایک گیت سنائے اور ایک چیری کے شگوفے کو اٹھا کر اپنے محبوب کے بالوں میں ٹکا دے -؟ لیکن نیلام گھر کی وحشی دیواروں نے اس محبت بھرے سوال کا جواب

نفرت اور حقارت سے دیا تھا۔ اور آج ایٹم بم کے بیٹوں نے کوریا کے بازاروں میں پھر وہی نیلام سجایا تھا۔

ہال میں ایک لمحے کی خاموشی رہی۔ دوسرے لمحے ہال میں سینکڑوں تالیاں چیخیں، سیٹیاں بج اٹھیں اور امریکی سپاہی وحشیانہ مسرت اور ہوس رانی کی آگ سے بھڑکتے گئے۔ کم آن۔ جلدی سے بولی شروع کرو۔" ایک ڈالر۔ میں بولی دیتا ہوں" ایک امریکی سپاہی زور سے چلایا۔

"دو ڈالر۔" دوسرا بولا۔

"تین ڈالر۔" تیسرا بولا۔

چار ڈالر۔ ایک دو.......... ایک دو.......... پانچ ڈالر..

ایک دو..... ایک دو....

بولی شروع ہو گئی۔ لیکن ایک لڑکی کے لئے کوئی بیس ڈالر سے زیادہ بولی نہ دے سکتا تھا اور ڈالر کے علاوہ دوسری قیمتی چیزیں بھی بولی میں قبول کر لی جاتی تھیں۔ مثلاً گھڑی فونٹین پن... ٹائی پن...... کسی لڑکی کی بولی ختم ہوتے ہی اس کے ہاتھوں کی رسی کاٹ دی جاتی اور اسے اسٹیج سے اچھال کے نیچے پھینک دیا جاتا۔ جہاں بہت سی اٹھی ہوئی بے قرار بانہیں اس کے ننگے جسم کو دبوچ لیتیں اور اسے ہاتھوں ہی ہاتھوں میں اٹھا کر آخری بولی دینے والے تک پھینک دیتیں۔ جو اس کی کمر میں بانہیں ڈال کے یا تو وہیں ناچنے لگ جاتا اور یا اسے اسی طرح اپنے بازوؤں میں اٹھائے ہال سے باہر لے جاتا۔

لائیم نے بڑے اطمینان سے اپنی پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالے اور جوس

کی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ جوسس نے آنکھ مار کے کہا۔ "بولی کیوں نہیں دیتے۔"
لائیم نے کہا۔ "ابھی اپنی پسند کی کوئی لڑکی نہیں آئی۔ جب آئے گی۔ بولی دیں گے۔ اور سب سے بڑھ کے دیں گے۔"

جوسس نے کہا "تم کیسی لڑکی چاہتے ہو؟ ہزل جیسی!"

"لائیم نے غصّے سے اُسے گھور کر کہا۔ "شٹ اپ۔ ہزل میری محبوبہ ہے۔ اس کی بات مت کرو۔"

قریب کھڑے ہوئے پستہ قد امریکی نے اسٹیج پہ کھڑی ایک ننگی کوریائی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہ بھی تو ہزل ہے۔ ریچل ہے۔ ازابیلا ہے۔ مجھے تو اس کے اور ایک امریکی لڑکی کے جسم میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔"

لائیم نے گھونسہ تان کے کہا۔ "چپ رہو تم کون ہوتے ہو بیچ میں بولنے والے۔"

اس پستہ قد امریکی نے بڑی تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں۔ میں کوئی نہیں ہوں۔ میں ایک معمولی امریکی سپاہی ہوں مگر مجھے یہ ہنگامہ پسند نہیں۔"

"پسند نہیں ہے تو یہاں کیوں کھڑے ہو۔ جاؤ کسی گرجا میں جاؤ۔۔۔۔ یا بکری کا دودھ پی کے خدا کا شکر ادا کرو باسٹرڈ!"

پستہ قد امریکی وہاں سے ہٹ گیا اور لائیم کی توجہ کو چابک کی آواز نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ چابک نیلام کرنے والے نے اس لڑکی کے جسم پہ مارا تھا۔ جو رسّی سے بندھی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس لڑکی کا رنگ تانبے کی طرح سرخ تھا۔ آنکھیں لال اور جلتی ہوئی اور بال بے حد گھنے اور لانبے وہ اپنی کوریائی زبان میں بلند لہجے میں کچھ کہہ رہی تھی۔ غالباً اپنی زبان میں ان سپاہیوں

کو گالیاں دے رہی تھیں۔ مینجر کا چابک پھر اس کے جسم پر پڑا۔ اور ایک لمبی نیلی دھار کا نشان اس کے تابنے کی طرح دہکتے ہوئے جسم پر چھوڑ گیا۔ لڑکی نے پھر اپنی پوری قوت سے دانتوں کو رستے میں گڑا کے کاٹ کھایا......"

لائیم نے اسے دلچسپی سے دیکھا اور بلند آواز میں کہا "بیس ڈالر۔"

اس نے سب سے پہلے بڑی بولی دے دی۔ بہت سے سپاہی اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔

لائیم نے کہا۔" ہاں ہاں کیا دیکھتے ہو۔ بولی میں نے دی ہے۔ لڑکی کو میری طرف پھینکو۔"

" بیس ڈالر اور ایک سونے کی گھڑی۔" سارجنٹ کارٹن پچھلی جنگ کا پیشہ ور سپاہی تھا۔ قد چھ فٹ سے اوپر نکلتا ہوا۔ بیل کی طرح گردن آنکھیں میلی۔ دانت میلے دل میلا، روح میلی اور جیسی روح ویسے فرشتے۔

لائیم نے سارجنٹ کارٹن کی طرف دیکھ کے غصہ سے کہا۔ بیس ڈالر اور ایک سونے کی گھڑی اور ایک فاؤنٹن پین۔"

سارجنٹ کارٹن بولا۔ بیس ڈالر اور ایک سونے کی گھڑی اور ایک فاؤنٹن پن ایک سونے کی انگوٹھی۔"

لائیم نے فوراً کہا۔" بیس ڈالر، سونے کی گھڑی، فاؤنٹن پن، سونے کی انگوٹھی اور میری پتلون کی بیلٹ، جس پہ چاندی کا بکل لگا ہوا ہے۔ پھینکو ادھر لڑکی کو۔ ورنہ میں پتلون اوپر پھینکتا ہوں۔"

بہت سے لوگ ہنس پڑے اور آخری بولی لائیم کی ہی منظور کر لی گئی۔ اور لڑکی

اس کی طرف پھینک دی گئی۔ لائیم نے اس سرکش، لڑتی ہوئی، جھنجھلاتی ہوئی، چیختی ہوئی لڑکی کو اپنے مضبوط بازوؤں میں تھام کر اسے دو چار چانٹے لگا کر رام کر لیا۔ اور اب وہ اس لڑکی کو اٹھا کر ہال کے باہر جانے والا تھا کہ کہیں سے مغربی دروازے سے ایک حبشی سپاہی سٹیج پر دوڑتا دوڑتا آیا اور ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔

"ساتھیو۔! یہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ٹھیک نہیں ہے حبشی۔؟"

"یہ نیلام گھر...... اسے بند کر دو۔ دوستو۔! بہت عرصہ ہوا، ہم نے جنوبی امریکہ کی ریاستوں میں اسی طرح کے نیلام گھر بنائے تھے۔ دوستو! جانتے ہو ہم نے اس گھر کی کتنی بڑی قیمت ادا کی ہے۔ میں کہتا ہوں......

"DIRTY NIGGER"......

سارجنٹ کارٹن زور سے چلایا۔

"میں کہتا ہوں اس حبشی کتے کو اسٹیج پر سے ہٹا دو۔" ہال میں سے ایک دم بہت سی آوازیں آئیں۔

"میں نہیں ہٹوں گا۔" حبشی سپاہی نے چلّا کر کہا۔ "یہ ٹھیک نہیں ہے۔ یہ غلط ہے۔ یہ ہماری انسانی تہذیب کے خلاف ہے۔"

"تہذیب۔" بہت سے سپاہی ہنسنے لگے۔ سالا سرخ ہے۔ کمیونسٹ ہے۔"

حبشی سپاہی نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ اور اپنے سر کو اونچا کر کے کہنے لگا "ساتھیو! میں کمیونسٹ نہیں۔ ایک معمولی امریکی شہری ہوں۔ میں ہارلم کا رہنے والا ہوں۔ ہارلم کی ساتویں گلی میں میری ماں رہتی ہے۔ میرے دو چھوٹے چھوٹے بھائی۔

اسی گلی کے آخری سرے پر جین کا مکان ہے۔ جین جو بے تحاشا ہنستی رہتی ہے جین جو ہر وقت باپ باپ کا رن کھاتی رہتی ہے۔ جین جو میری منگیتر ہے۔ جین جو بالکل ان ہی کوریائی لڑکیوں کی طرح ہے۔ میری منگیتر کا احترام کرو دوستو۔" بالکل کمیونسٹ ہے۔" سارجنٹ کارٹن نے پستول نکال لیا اور چلّا کے کہنے لگا۔" اسے اسٹیج سے نیچے پھینک دو۔"

حبشی بولا۔" میں کمیونسٹ نہیں ہوں۔ میں نے مارکس نہیں پڑھا ہے۔ میں نے صرف انجیل پڑھی ہے۔ مجھے آج تک کسی کمیونسٹ سے ہاتھ ملانے کا موقع نہیں ملا۔ بھوک سے کئی دفعہ ہاتھ ملا چکا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ کمیونزم کیا بلا ہے۔ ہاں میرے گرجا کے سفید پادری نے مجھ سے اتنا ضرور کہا تھا کہ جو آدمی اچھے ہوتے ہیں وہ عورت کی عزّت ضرور کرتے ہیں کیوں کہ عورت ہماری ماں ہوتی ہے، بہن ہوتی ہے۔ منگیتر ہوتی ہے عورت ہماری تہذیب کی عزّت ہوتی ہے۔ اس سفید پادری نے مجھ سے یہی کہا تھا۔"

"بالکل کمیونسٹوں کی سی باتیں کرتا ہے۔" لائیم نے گھونسہ تان کے کہا۔

"یہ سُرخا ہے۔ اسے جلا ڈالو۔ اسٹیج سے نیچے پھینک دو۔"

حبشی سپاہی کا چوڑا چکلا سینہ اب عجیب غرور اور افتخار کے ساتھ تن گیا۔ اس نے آہستہ سے لیکن بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔" نہیں بھائیو۔ میں یہاں سے نہیں ہٹوں گا۔ جب تک تم اس نیلام گھر کو بند نہ کرو گے۔ مجھے تھوڑی سی امریکی تاریخ یاد ہے۔ اسے دو سو سال بھی نہیں گذرے اور افریقہ کے گھنے جنگلوں والے ساحل پر سمندری کشتیاں جب لنگر انداز ہوتی تھیں۔ تو گھنے جنگلوں میں سے ہرے ہرے طوطوں والے نیلی چڑیوں، چارہ کھاتے زرافوں اور خاموش جھیلوں والے افریقی ماحول میں سے میرے آباؤ اجداد کو ان کے گھروں سے زبردستی پکڑ کے ان سمندری کشتیوں کے سفید مالک انہیں امریکہ

لے گئے تھے۔ وہاں مستی سی پی کی دریائی کشتیوں کے ڈیک پر ایسے ہی نیلام گھر لگے تھے۔ بالکل ایسا ہی منیجر تھا۔ ایسے ہی اس کے ہاتھ میں چابک تھا۔ اس چابک سے کالے جسم پر اسی طرح خون کی دھاری اُبھر آتی تھی۔ دوستو! اس دھاری کی ہم نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہے۔ تین سال کی امریکی خانہ جنگی میں ہزاروں ماؤں کے لال مر گئے.. لاکھوں عورتیں بیوہ ہو گئیں اور جنوبی اور شمالی امریکہ کے لئے نفرت کے دیوار بندھ گئی دوستو۔! اب اس خطرناک تماشے کو دوبارہ شروع نہ کرو۔ میں تم سے انسانیت نہیں امریکی تاریخ کے نام پر کہتا ہوں۔ یہ نیلام گھر اب نہیں چل سکتا۔ یہ کوریا کا نیلام گھر اب مٹ جائے گا۔ جیسے چنگیز خاں کا نیلام گھر مٹ گیا جیسے ہلاکو خاں کا مٹ گیا، جیسے روم، یونان، دمشق، برلن، ایسے ہی یہ نیلام گھر بھی مٹ جائے گا یہ ظلم مٹ جائے گا۔ لیکن ایشیا کی عورت زندہ رہے گی۔"

یکایک ہال میں سے تین گولیوں کے چلنے کی آواز آئی اور لمبے چوڑے چکلے حبشی کا جسم زور سے کانپا۔ اس کے پھیلے ہوئے ہات دونوں طرف رسّوں کی گرفت میں آ گئے۔ اس کی گردن ایک طرف کو جھک گئی جیسے آج سے کوئی دو ہزار سال پہلے مسیح کی جھکی تھی۔ پھر اس کا بھاری جسم تڑپ تڑپ کے رسوں پر جھک گیا اور وہاں سے اوندھا ہو کے نیچے سپاہیوں پر دھڑام سے جا گرا۔ اس کے گرتے ہی ہال میں سے قہقہے کی آوازیں آئیں اور خون کی ایک دھار سٹیج کو سرخ کرتی ہوئی نیچے تک فرش کو لال کرتی چلی گئی۔

چند سپاہیوں نے اس کی لاش کو اٹھا کے باہر برآمدے میں پھینک دیا اور پھر بولی شروع ہو گئی۔

"ایک ڈالر، ایک لڑکی، ایک گھڑی، ایک لڑکی، ایک ٹائی پن، ایک لڑکی

ایک چاندی کا سگریٹ کیس، ایک لڑکی۔"

نیلام بڑھتا گیا۔ سٹیج خالی ہوتی گئی۔ سٹیج کے پیچھے امریکی جھنڈا مسکراتا گیا۔ جھنڈا جس پر تارے اور دھاریاں تھیں۔ تارے اور گہری نیلی زمین پر سفید دھاریاں۔ تارے اور سونے ایسے جسم پر نیلی دھاریاں، تارے اور چابکیں۔ ۔۔۔۔!

تھوڑی دیر کے بعد اسی عمارت کے ایک چھوٹے سے کمرے میں لائیم سارجنٹ کارٹن اور روس تین ننگی کوریائی لڑکیوں کو اپنی رانوں پر بٹھائے تاش کھیل رہے تھے اور پی رہے تھے۔ کھیل دلچسپ تھا۔ لڑکیاں بھی اچھی تھیں۔ شراب بھی بڑی نہیں تھی اور اب تو وہ سرکش لڑکی بھی لائیم کی آغوش میں چپ چاپ بڑی متانت سے بیٹھی تھی۔ ہاں کبھی کبھی اس کے بڑے غلافی پپوٹوں کے اندر سے ایک نظر بجلی کے کوندے کی طرح لپکتی ہوئی۔ اُبھر آتی اور دوسرے لمحے میں وہ بجلی پھر کہیں اندر ہی اندر غائب ہو جاتی۔ سارجنٹ کارٹن نے یکایک تاش کے پتے میز پر پھینک کر کہا۔

"جانے دو اس کھیل میں مزہ نہیں آرہا ہے۔"

"مجھے تو بہت اچھا لگ رہا ہے۔" لائیم بولا۔

کارٹن نے کہا۔ میں غلاموں کا کھیل کھیلنا چاہتا ہوں۔ جس میں غلام بیگم سے بڑا ہوتا ہے۔

لائیم نے پوچھا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ تاش میں ہمیشہ بیگم غلام سے بڑی ہوتی ہے۔"

کارٹن نے کہا۔ "یہ نیا کھیل ہے۔ پچھلی جنگ میں ہم نے اسے نازی قیدی

سپاہیوں سے سیکھا تھا۔ اس کھیل میں بیگم غلام سے چھوٹی ہوتی ہے۔ کیوں جوس؟"

جوس نے کہا۔ "ہاں مگر اس کے لئے تو چار آدمی چاہئیں۔ اور ہم تین ہیں۔"

کارٹن نے لائیم کی آغوش میں بیٹھی ہوئی کوریائی لڑکی کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ کے کہا نہ کہنے کو تو ہم چھ ہیں۔ مگر یہ لڑکیاں ہمارا کھیل نہیں جانتیں۔ یہی تو مصیبت ہے۔"

لائیم نے کہا۔ "میں سمجھ گیا سارجنٹ، تم کیا چاہتے ہو۔؟"

"کیا؟" سارجنٹ نے پوچھا۔

لائیم نے ایک شیطانی مسکراہٹ سے کہا۔ "تم جو شے بولی دے کر حاصل نہ کر سکے تاش کے کھیل سے جیت لینا چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے نا۔؟"

سارجنٹ نے اثبات میں سر ہلایا۔

لائیم نے آہستہ سے کہا۔ "مجھے منظور ہے۔"

"مگر وہ چوتھا پارٹنر......؟" جوس نے پوچھا۔

سارجنٹ اٹھ کر دروازے کے باہر گیا۔ باہر وہی پستہ قد سپاہی ایک کوریائی لڑکی کو اپنا لمبا کوٹ اوڑھائے، آہستہ آہستہ سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ سارجنٹ نے اُسے آواز دی۔ "ہے یڈی....."

پستہ قد امریکی نے مڑ کے سارجنٹ کی جانب دیکھا۔ سارجنٹ نے اسے اپنی جانب بلایا۔ پستہ قد امریکی اپنی کوریائی لڑکی کو لئے سارجنٹ کی جانب بڑھا۔

سارجنٹ نے اس سے پوچھا۔ "اُسے کیوں کوٹ اوڑھا رکھا ہے؟"

"یہ کوٹ میرا ہے" پستہ قد امریکی نے جواب دیا۔

"مگر یہ کوٹ اس کام کے لئے نہیں ہے، نکلوا سے -" سارجنٹ نے کہا - اور کہتے کہتے خود ہی اس کوریائی لڑکی کا کوٹ اتار کے اسے پھر ننگا کر دیا - اتنے میں لائیم بھی دروازے پر آگیا - اس نے پستہ قد امریکی کو دیکھتے ہی بڑی حقارت سے کہا "تمہیں تو یہ ہنگامہ پسند نہیں تھا - پھر تم کیسے اس ننگی لڑکی کے ساتھ گھوم رہے ہو -

پستہ قد امریکی مسکرایا - اس کے سامنے کے دو دانت غائب تھے - آہستہ سے بولا

"میں بھی سب کے ساتھ ہوں -"

جوس نے دروازہ بجاتے ہوئے کہا - "تو اندر آجاؤ - تاش کھیلیں گے ...."

"کون سا کھیل ؟" پستہ قد امریکی نے اندر آتے ہوئے پوچھا -

"وہی جس میں غلام بیگموں سے بڑے ہوتے ہیں -"

وہ چوتھی کرسی پر اپنی کوریائی لڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا - جوس کے پوچھنے پر اس نے اپنا نام "سمپسن" بتایا -

لائیم نے پوچھا - سمپسن ؟ تمہارا کہیں اس دوسرے بڑے سمپسن کے گھرانے سے تو کوئی رشتہ نہیں ؟"

"ہے !"

"کیا رشتہ ہے -؟"

"وہی غلاموں کا رشتہ ہے - وہ مالک ہیں - میں غلام ہوں - ہم سب غلام ہیں - سب چھوٹے سمپسن بڑے سمپسنوں کے غلام ہیں - اچھا آؤ ! تاش پھینٹو - لاؤ میں کاٹتا ہوں - اچھا سارجنٹ، بتاؤ تم کس کے غلام ہو ؟

سارجنٹ نے کہا - "میں اینٹ کا غلام ہوں اور پھر اس نے اپنی گود میں بیٹھی

ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "اور یہ میری گودیں اینٹ کی بیگم ہے۔"

جوس نے کہا۔ "میں چڑیا کا غلام ہوں اور یہ میری چڑیا ہے۔"

پستہ قد امریکی نے کہا۔ "دیکھنا کہیں پھر سے اُڑ نہ جائے۔"

لائیم نے ہنس کے کہا۔ "یہ میری پان کی بیگم ہے جس پر سارجنٹ کی نظر ہے۔ اور میں اس کا غلام ہوں۔" پھر اس نے سمپسن کی طرف مڑ کے کہا۔ "اب تمہارے لئے تو پسند کا سوال ہی نہیں رہا۔ تم تو حکم کے غلام ہو۔"

سمپسن نے کہا۔ "غلاموں کے لئے پسند کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ وہ تو ہمیشہ حکم کے غلام ہوتے ہیں۔ چاہے وہ میک آرتھر کا حکم ہو یا ٹرومین کا حکم ہو یا اس سے کسی بڑے سیٹھ کا حکم ہو، جس سے بنکوں، تیل کے چشموں اور لوہے کے کارخانوں پر قبضہ ہے۔"

کارٹن نے اپنی پیٹی ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔ "اب اپنی گندی سیاست بند کرو اور کھیل شروع کرو۔"

سمپسن نے کہا۔ "میں حاضر ہوں۔ چلئے۔ مگر کھیل کی شرط کیا ہے۔؟"

کارٹن نے کہا۔ "شرط میں یہ لڑکیاں بدی جائیں گی۔ اگر تم حکم کے غلام ہو۔ اور تمہارے پاس حکم کی بیگم آتی ہے تو یہ لڑکی تمہارے پاس ہی رہتی ہے لیکن اگر یہ حکم کی بیگم لائیم کے پاس نکل جاتی ہے تو یہ لڑکی تمہاری گود سے اٹھ کر لائیم کے پاس چلی جائے گی۔ اسی طرح میں اینٹ کا غلام ہوں۔ لیکن میرے پاس پان کی بیگم نکل آتی ہے۔۔۔۔۔۔۔"

"جس کا کوئی چانس نہیں۔" لائیم نے بات کاٹ کے کہا۔

کارٹن نے سرخ ہو کے کہا ۔" تو پان کی بیگم میری ہو جائے گی ۔ اس طرح سے اگر کسی کے پاس چار بیگمیں اکٹھی ہو جائیں تو وہ چاروں لڑکیاں جیت لے گا۔ گرانڈ نیلام !"

جوس نے خوش ہو کے کہا ۔" بہت اچھا کھیل ہے ۔ اب جلدی سے تاش پھینٹو ......"

وہ لوگ تاش پھینٹ کر اپنے کھیل میں مشغول ہو گئے ۔ کافی عرصہ تک کسی کے پاس کوئی بیگم نہ نکلی ۔ پھر لائیم کے پاس اینٹ کی بیگم آئی اور سمپسن نے برس سے کہا ۔" میں نے کہا نہ تھا تمہاری چڑیا پھُر سے اڑ جائے گی "

اس کے فوراً بعد ہی سمپسن کو اپنی لڑکی سے ہاتھ دھونا پڑے ۔ اور وہ اُٹھ کر سارجنٹ کی آغوش میں چلی گئی ۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد سارجنٹ کے پاس اینٹ کی بیگم نکل آئی اور اب اس کے پاس دو لڑکیاں ہو گئیں لیکن جو بیگم وہ اپنے پتوں سے نکالنا چاہتا تھا ۔ وہ اس کے پاس نہ آتی تھی اور لائیم بدستور مسکرا رہا تھا اور سارجنٹ کو طعنے دے رہا تھا ۔" پان کی بیگم اپنے غلام کے پاس بہت خوش ہے ۔ وہ تمہارے پتوں میں کبھی نہیں آئے گی سارجنٹ ۔"

یکایک باہر ایک زور کا دھماکہ ہوا اور سارجنٹ لائیم اور جوس اٹھ کر فوراً باہر گئے گو سیول فتح ہو چکا تھا لیکن شہر کے بیچ میں ایک میل کے مربع میں ابھی تک گلیوں کوچوں اور بازاروں اور عمارتوں کے اندر لڑائی جاری تھی ۔ اور شہر کے دوسرے حصوں میں بھی کہیں کہیں گوریلا گوریاؤں کے گھونسلے اپنی مشین گنوں سے امریکی جانوں کا شدید نقصان کر رہے تھے...

جب سارجنٹ لائیم اور جوس واپس اندر آئے تو انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے اندر کی فضا تھوڑی سی بدل چکی ہے ۔ انہوں نے شبہے کی نظروں سے سمپسن کی طرف دیکھا

لیکن سمپسن چپ چاپ اپنے پتے اُلٹنے میں مشغول تھا - لڑکیاں چپ چاپ اپنی کرسیوں پر بیٹھی تھیں - لائیم کو شبہہ ہوا جیسے اس نے اپنی پان کی بیگم کے چہرہ پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ کی جھلک دیکھی ہے - مگر نہیں، یہ اس کا واہمہ تھا - اس نے اپنی غلامی قبول کر لی تھی اور اب بڑی متانت سے پھر اس کی گود میں بیٹھ گئی تھی -

سمپسن نے پوچھا - "دھماکہ کیسا تھا - ؟"

سارجنٹ نے کہا - "سامنے کے بڑے بازار کے چوک میں ایک بڑی عمارت کو ہمارے جہازوں نے بمباری سے اُڑا دیا ہے اس میں کئی سو گوریلا مسلسل سات دنوں سے لڑ رہے تھے اور ان پر فتح پانے کی کوئی صورت نہ تھی - سوائے اس کے کہ انہیں بالکل ختم کر دیا جائے -"

"بہت خوب -" سمپسن نے کہا - "اب آگے چلو - خدا کا شکر ہے کہ اس عمارت پر اپنا پورا قبضہ ہو چکا ہے - یہاں کوئی سرخ نہیں ہے -"

کھیل پھر شروع ہوا - کبھی سارجنٹ کے پاس دو لڑکیاں ہو جاتیں - کبھی لائیم کے پاس کبھی جوس کے پاس - ایک دفعہ تو سارجنٹ کے پاس تین لڑکیاں ہو گئیں لیکن پان کی بیگم اس کے پاس کبھی نہ نکلی اور وہ بڑا جھنجھلایا ہوا کھیلنے لگا - اب بات بات میں لائیم اسے طعنے دینے لگا - "جانے کیا بات ہے - پان کی بیگم تمہارے پاس نہیں نکلتی -" یہ پان کی بیگم اب تک جوس کے پاس پہنچ چکی تھی اور سمپسن کے پاس بھی لیکن سارجنٹ کی آغوش پان کی بیگم سے خالی تھی - وقت گذرتا جا رہا تھا - شام کا اندھیرا بڑھنے لگا - باہر سے گوریلا مشین گنوں کے گھونسلوں سے آوازیں تیز تر ہو گئی تھیں مگر سارجنٹ کے پاس پان کی بیگم نہ آئی - اس کے تینوں ساتھیوں نے اسے کھیل بند کرنے کو کہا - لیکن سارجنٹ نہیں مانا - آخر لائیم نے اس سے

کہا۔ "جاؤ سارجنٹ میں اپنی پان کی بیگم تمہیں مفت میں بخشتا ہوں۔" مگر سارجنٹ کو لائیم کا یہ تحقیر آمیز جملہ اور بھی کھٹکا اور وہ اور بھی مستعدی سے کھیل میں مشغول ہو گیا۔ آخر جب شام بہت گہری ہو گئی تو سمپسن نے یکایک کہا۔ "بھئی بہت ہو چکا اب کھیل کا آخری داؤ چلو۔ بات ختم کرو۔" سارجنٹ نے کہا۔ اچھا آخری داؤ سہی مگر پتے میں کاٹوں گا۔"

لائیم مسکرا کر تاش پھینٹ رہا تھا۔ سمپسن نے کہا۔ "پتے پھینٹنے کی باری تمہاری ہے لیکن مجھے پھینٹنے دو۔"

"کیوں؟" لائیم لالا۔

سمپسن نے مسکرا کر کہا۔ "آخری داؤ ہے۔ بات مان جاؤ۔"

لائیم نے تاش سمپسن کے حوالے کر دیا۔ سمپسن نے سارجنٹ کی طرف دیکھا لائیم کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں تاش پہ گڑی تھیں۔ سمپسن آہستہ سے تاش پھینٹنے لگا۔

لائیم نے کہا۔ "شغل۔"

سارجنٹ بولا۔ "رمی شغل۔"

سمپسن نے تاش پھینٹ کر میز پر رکھ دیا سارجنٹ نے کہا۔ "میں کاٹوں گا۔"

لائیم نے سانس روک کر آہستہ سے سر ہلا دیا۔

سارجنٹ نے تاش کاٹ کر پتہ اُٹھایا۔ پان کی بیگم تھی۔

لائیم کھڑا ہو گیا۔ اس نے بھاری آواز میں کہا۔ "یہ دھوکا ہے۔ سمپسن تم سے مل گیا ہے۔ یہ جعلسازی ہوئی ہے۔"

"اس کا کیا ثبوت ہے۔" سارجنٹ نے چلا کے کہا۔ اب وہ بھی کرسی سے اُٹھ گیا تھا۔

"اس کا ثبوت یہ ہے۔" لائیم نے کہا کہ "میں نے آخری داؤ سمجھ کر پان کی بیگم کا پتہ پہلے ہی نکال لیا تھا۔

"یہ دیکھو۔" لائیم نے اپنے ہاتھ میں پان کی بیگم کا پتہ دکھایا۔

سمپسن بولا۔ "مجھے معلوم تھا۔ اس لئے میں نے جعلسازی پر جعلسازی کی اور ایک دوسری پان کی بیگم سارجنٹ کے پتوں میں رکھ دی۔ . . . . " میں ہمیشہ جعل سازوں کے ساتھ جعل سازی کرتا ہوں۔ . . . . ادھر گھر پر میرا یہی پیشہ تھا۔ . . . "

لائیم نے پستول نکال لیا۔ لیکن یکایک عین اس موقع پر دروازے پر ایک بھاری قدموں والا امریکی سپاہی، لڑکھڑا کے گر پڑا اور گرتے ہوئے بولا۔

"گوریلا عمارت کے اندر آن پہنچے ہیں۔ انہوں نے نیچے کی گارد کا صفایا کر دیا ہے جلدی سے بھاگو۔"

لائیم، کارٹن، جوس، سمپسن، سبھی لڑکیاں چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ اتنے میں پان کی بیگم نے چلا کے کہا "ٹھہرو۔"

امریکی سپاہیوں نے مڑ کے دیکھا کہ پان کی بیگم نے چلا کے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ "تم نے سوچا تھا کہ اس عمارت میں کوئی سُرخ نہیں ہے لیکن تم بھول گئے کہ پان کی بیگم کا رنگ ہمیشہ سرخ ہوتا ہے۔"

اتنا کہہ کے اس نے لائیم کے سینے پر پستول چلا دیا۔ عین اسی وقت سیڑھیوں سے بھی کسی کے گولی چلانے کی آواز آئی۔

تھوڑی دیر بعد سب طرف سناٹا چھا گیا۔ گوریلاؤں نے ساری عمارت پر پھر سے قبضہ لے لیا اور جگہ جگہ مشین گنوں کے گھونسلے جما دیئے۔ سیڑھیوں کے قریب ہی دروازے

پر کارٹن سمپسن، جونس اور لائیم کی لاشیں پڑی تھیں۔ اور دروازے پر ایک اور امریکی لاش پڑی تھی اور اندر وہ تین کوریائی لڑکیاں بھی مردہ پڑی تھیں جنہیں ان کے امریکی خریدنے والوں نے نیلام گھر سے خریدا تھا اور اس دنیا سے جاتے ہوئے ان کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ چوتھی لڑکی یان کی بیگم بھی سخت زخمی ہو گئی تھی۔ اور اس کے اوپر ایک گوریلا جھکا ہوا تھا اور اس کے شانے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر کہہ رہا تھا۔ منگ منگ! اٹھو! ہوش میں آؤ۔ میں آگیا تمہارا ہک کو۔ منگ آنکھیں کھولو ایک لمحے کے لئے.....»

منگ نے آنکھیں کھول کر ہک کو کی طرف دیکھا۔ اس کے پتلے لبوں پر ایک بڑی ہی دردناک جاں گسل مسکراہٹ آئی۔ اس نے آہستہ سے اپنا بازو اٹھا کر ہک کو کے شانے پر رکھ دیا۔ اور بڑی نرم آواز میں بولی "ہک کو..... مجھے معاف کر دو۔ میں نے آخری دم تک تمہارا کہنا نہیں مانا اور گوریلا فوج میں بھرتی ہونے سے انکار کر دیا۔ مجھے اس خطرے کا پتہ نہ تھا.....

ہک کو نے پریشان ہو کے کہا۔ "مگر تم یہاں کیسے آگئیں منگ؟"

منگ بولی۔" میں آئی نہیں۔ لائی گئی ہوں۔ زبردستی میری طرح اور بھی چار سو لڑکیاں تھیں۔

"چار سو؟" ہک کو نے وحشت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"ہاں ہک کو۔" "ہم چار سو تھیں" منگ نے آہستہ سے رک رک کے کہا۔

ہک کو نے پوچھا۔ "پھر کیا ہوا؟"

منگ نے کہا۔" وہ مجھے بالوں سے پکڑ کر گھر سے باہر گھسیٹ لائے۔ پہلے میں ننگی کی گئی۔ پھر ایک نیلام گھر میں جانور کی طرح بیچی گئی۔ پھر تاش کے پتوں کی طرح کھیلی گئی

ہک کو! کیا ہم لوگ جانور ہیں؟ تاش کے پتے ہیں؟....."

ہک کو چپ رہا۔ اس کے سینے میں ہیجانوں کا تلاطم تھا مگر وہ اس وقت بول نہ سکتا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

منگ پھر آہستہ سے بولی۔"مگر میں نے انتقام لے لیا ہے۔ ہک کو، تمہاری منگ نے اس کے خریدنے والے کو اس کی گولی کا نشانہ بنا دیا وہ لوگ چپ چاپ بیٹھے تھے میں نے بڑے آہستہ سے ایک کی پیٹی سے ریوالور نکال لیا.......... اسے پتہ بھی نہ چلا......."

ہک کو کے پتھریلے چہرے پر شادابی کی کرنیں دوڑ گئیں۔ اس نے منگ کو کے سر کو کے سر کو سہارا دے کر بڑے پیار سے کہا۔"منگ میں جانتا تھا۔ کبھی نہ کبھی تجھے بھی گوریلا بننا پڑے گا۔ کاش تو پہلے ہی سے بن جاتی۔ کتنی گہری خندقوں میں کیچڑ سے بھرے ہوئے گڑھوں میں اور پہاڑوں کی غاروں میں مجھے تیری یاد آئی ہے۔ لیکن ہر بار میں نے تیری یاد کو نفرت کی گالی دے کر اپنے اندر سے باہر پھینک دیا.....'

منگ جو گوریلا نہ بن سکی۔ منگ جو اپنے دیش کے لئے نہ لڑ سکی۔

منگ کا دوسرا ہاتھ بھی اُوپر اُٹھ گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔"اب تو اپنی منگ کو معاف کر دو۔ وہ اس دنیا سے جا رہی ہے۔"

منگ کے ہونٹوں سے لہو بہہ نکلا۔ لہو اور لعاب جسے ہک کو نے اپنے ہاتھوں سے صاف کر دیا۔ اور منگ کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں اور وہ بڑی کمزور آواز میں بولی۔

"یاد ہے ہک کو، جب تم پہلی بار ہمارے گاؤں میں آئے تھے اور میں اپنے گھر کے باہر سفیدے کے جھنڈ تلے تمہیں ملی تھی اور تم نے امن کی اپیل کا کاغذ میرے

سامنے بڑھا دیا تھا۔'

"یاد ہے۔" ہک کو نے کہا ... " وہ بہار کے دن تھے۔ تمہارے گاؤں میں آڑو کے درختوں پر سفید سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہی پھول تمہارے بالوں میں بھی چمک رہے تھے۔"

"اور وہ چاندنی رات بھی یاد ہے۔" منگ بولی "جب محبت ہمارے دلوں سے بانسری کا نغمہ بن کے پھوٹی تھی۔ تم بانسری بجا رہے تھے۔ میں تمہاری آغوش میں تھی اور ہمارے سر کے اُوپر شمشاد کے پتے جھول رہے تھے۔ وہ پتے جن کا رنگ ایک طرف سے سبز ہوتا ہے اور دوسری طرف سے چاند کی طرح سفید ہوتا ہے۔ اور آنکھوں میں کبھی زرد جھلکتا ہے کبھی چاند۔"

"یاد ہے۔" ہک کو نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "اس وقت امریکی سپاہیوں نے اس گاؤں کو جلایا نہیں تھا۔ . ."

منگ نے آنکھیں کھول کر ہک کو کی طرف دیکھا اور بالکل مدھم سرگوشی میں کہا۔

"اور اس رات ہم نے سوچا تھا کہ دنیا میں امن ہوگا اور ہم اپنا چھوٹا سا گھر بسائیں گے جس کے اندر ایک چھوٹا سا آنگن ہوگا۔ ایک چھوٹا سا بچہ ہوگا۔ ہمارا پہلا بچہ اور انگنائی میں چیری کے شگوفے ہوں گے اور تم میرے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کھا کے دھان کے کھیتوں میں جاؤ گے ......"

اور ہک کو وہ سب کچھ یاد آیا اور اس کی جوانی کی تصویر اس کی محبت کی تنویر ایک لمبی عالم گردش میں ایک شمع کی طرح جلتی ہوئی نظر آئی۔ پھر ہوا کے ایک ہی جھونکے سے بجھ گئی اور اس کی محبت مر گئی۔ اسے یہ محسوس ہوا جیسے منگ کے ہاتھ سرد پڑ گئے ہیں اور اس

کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں۔ وہ آنکھیں جو ہک کو کی محبت اپنے چھوٹے سے گھر شمشاد کے بوٹے، بچوں کی ہنسی اور چیری کے شگوفے کو ترستی ہوئی کھلی کی کھلی رہ گئیں اور ہک کو محسوس ہوا جیسے اس کے اپنے گال گیلے ہو گئے ہیں۔ اور اس نے اپنے کھردرے ہاتھ سے اپنے گالوں کی نمی کو دور کیا آہستہ سے منگ کی آنکھیں بند کر دیں۔ آہستہ سے اس کے چہرے پر اپنی فوجی ٹوپی ڈال دی۔ آہستہ سے اپنا کوٹ اتار کے اس کے جسم پر ڈال دیا۔ اور آہستہ آہستہ الٹے پاؤں کمرے سے باہر نکل آیا۔

باہر برآمدے میں اکتوبر کی خشک رات تھی۔ ننگے آسمان پر تارے ٹھٹھر رہے تھے۔ کہیں کہیں کوئی زور کا دھماکا ہوتا، کہیں کہیں کوئی عمارت گر جاتی اور پھر لال لال شعلے افق پر لہرانے لگتے۔ پھر دور اور نزدیک سے مشین گنوں کے چلنے کی مسلسل آواز آتی۔ اور پھر ایک دم سناٹا چھا جاتا۔ ایسے ہی سناٹے کے وقفے ہک کو نے برآمدے میں ایک لمحے کے لئے کھڑے کھڑے سوچا آج منگ بہت دور چلی گئی ہے اور میرے کوریا کے لئے کالی اندھیری رات ہے لیکن کیا دنیا کے لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ کس طرح آج کوریا اپنے خون سے امن کی اپیل پر دستخط کر رہا ہے۔

ہک کو نے گھور کر رات کی تاریکی میں دیکھا جیسے وہ اس کالی پھیلی ہوئی رات کی تاریک وسعت سے اپنا جواب چاہتا ہو۔ یکایک رات کا سناٹا گوریلا مشین گنوں کے مسلسل شور سے ٹوٹ گیا اور جیسے ہک کو کو اپنا جواب مل گیا اور اس نے مسکرا کر اپنی گن کے جبڑے میں کارتوس کی بیٹی اچھی طرح جما دی اور اپنے مورچے پر جم کر بیٹھ گیا۔

اس نے آہستہ آہستہ اپنے کارتوسوں کو گنا جیسے وہ موتیوں کے دانے گن رہا ہو۔ انہیں گنتے گنتے اس کے لبوں پر ایک مغرور مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے اپنے

دل سے کہا - ہم جانور ہیں، نہ تاش کے پتے - ہم کوریا کے آزاد انسان ہیں - دشمن ہمارے ملک کے کونے کونے پر قبضہ کر سکتا ہے لیکن ہمارے دل کا ایک کونہ بھی اُسے نہیں مل سکتا اور جب تک ہمارے دل آزاد ہیں ہمارا کوریا آزاد رہے گا - بے شک آج رات کالی ہے لیکن اس میں کہیں کہیں تارے بھی ہیں - بے شک آج سیول جل رہا ہے لیکن آج سیول جلتے ہوئے بھی لڑ رہا ہے - سیول کو سامراجی کبھی نہیں جیت سکتے - سیول کوریا کا دل ہے -

محبّت کی گھاٹی

گھاٹی کی گود میں دو راستے تھے۔

ایک راستہ تو گھاٹی کے اوپر سے جاتا تھا اور بیار اور چیل کے درختوں سے گزرتا تھا۔ دوسرا گھاٹی کے قدموں سے لگ کے وادی کے کنارے کنارے چل رہا تھا۔ جہاں دھان کے کھیت تھے اور کھیتوں کے کنارے مویشی چر رہے تھے اور راستے کے اوپر ترناری اور نیلا دھاری کی بیلیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان دونوں راستوں کے بیچ میں ایک گھاٹی تھی لیکن بہت اونچی نہیں تھی۔ اس لئے اُوپر کے راستے سے نیچے کا راستہ اور نیچے کے راستے سے اُوپر کا راستہ صاف نظر آتا تھا۔

اُوپر کے راستے سے ایک نوجوان لڑکا چل رہا تھا اور نیچے کے راستے سے ایک نوجوان لڑکی جا رہی تھی اور ان دونوں راستوں پر دور دور تک اور کوئی نہیں تھا۔

نوجوان ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکا۔ اس نے ایک تناور بیار سے لگ کے اپنے

ماتھے کا پسینہ پونچھا اور اپنے خاکی رنگ کے جھولے کو ٹھیک کیا اور پھر جھک کر اس نے نیچے کے راستے پر نگاہ ڈالی۔ لڑکی بغیر رُکے آگے جارہی تھی۔ عیدل مسکرایا وہ سات کوس سے اکٹھے چلے آرہے تھے۔ گو ان دونوں کے راستے الگ الگ تھے اور دونوں کے بیچ میں گھاٹی تھی اور دونوں ایک دوسرے کو نہیں جانتے تھے پھر بھی عیدل کو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ وہ دونوں ہم سفر ہیں اور ان دونوں کے درمیان ہمدردی کا وہی رشتہ ہونا چاہیئے جو دونوں ہم سفروں کے درمیان ہوا کرتا ہے۔

مگر شاید وہ اکیلے سفر کرنے کی عادی تھی۔ اس لئے وہ اس رشتے کے نازک حُسن کو پہچان نہ سکی۔ یہ سوچ کر عیدل کے فراخ ماتھے پر تیوری چڑھ گئی اور اس کا مضبوط جبڑا اُوپر اُبھر آیا۔ پھر وہ جیسے درگذر کرنے والے انداز میں مسکرایا۔ اور اپنی خمیدہ ٹھوڑی کھجانے لگا۔ جس پر دو دن کے بالوں کی جڑیں ابھر آئیں تھیں اس نے گردن پھیر کے لڑکی کی طرف دیکھا جواب تھوڑی دور اور آگے نکل گئی تھی۔ یہ لڑکی اسے گوراہ کے قریب ملی تھی۔ پہلے راستے میں ایک گھر کے سامنے ایک عورت اسے رخصت کر رہی تھی اور وہ اس کی خوبصورتی دیکھ کے ٹھٹھک گیا تھا۔ گو یہ گھاٹی اچھی خاصی اونچی نیچی ہوتی رہتی ہے اور پہاڑی راستے الگ الگ چلتے ہوئے کبھی ایک دوسرے کے اتنے قریب آجاتے ہیں کہ چند گزوں کا ہی فاصلہ رہتا ہے اور کبھی اتنے قریب آکے اتنے دور ہوجاتے ہیں کہ بیچ میں ہزاروں گز کا فاصلہ پڑ جاتا ہے۔ پہاڑی راستے جو ئے یہ زندگی کا انداز پہچانتے ہیں۔ جب راستے دور سے آتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب ہوتے جاتے ہیں۔ قریب ہو کے مل جاتے ہیں اور بچھڑ جاتے ہیں۔ ' زندگی ' عیدل نے سوچا۔ سیدھی سڑک نہیں ہے پہاڑی راستہ ہے اور یہ راستہ گوراہ کے قریب وادی کے راستے سے اتنا قریب ہوگیا تھا۔ کہ اس نے اس لڑکی کے

دلآویز خال و خال کو قریب سے دیکھ لیا۔ اور وہیں ٹھٹھک کے رہ گیا۔ جس عمر میں ہر نوجوان عورت حسین معلوم ہوتی ہے۔ جس علاقہ کا وہ رہنے والا تھا۔ اس وادی کا حسن ساری دنیا میں مشہور ہے۔ پھر بھی ایسی رنگت، ایسا نکھار، ایسی صباحت، ایسی دلربائی اس نے شاید ہی دیکھی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس کا سانس رُک گیا تھا اور اس کے قدم رُک گئے تھے۔ اور رستہ رُک گیا تھا۔ اور آسمان میں اڑتے اڑتے بادل رُک گئے تھے کیوں کہ جب خوب صورتی سامنے آتی ہے تو زندگی ایک لمحے کے لئے رُک کر اور جھک کر اسے خراج تحسین ادا کرتی ہے اور پھر آگے بڑھ جاتی ہے۔ عبدل بھی آگے بڑھ گیا اور اس نے گردن موڑتے موڑتے بھی دیکھ لیا کہ نوجوان لڑکی سے گلے ملنے والی بڈھی عورت کی آنکھ میں آنسو چھلک رہے ہیں اور نوجوان لڑکی کا رخ سورج کی تیز روشنی میں چمک رہا ہے۔

پھر عبدل نے دیکھا کہ لڑکی نچلے رستے پر اسی سمت پر چل رہی ہے جس سمت وہ جا رہا تھا اور گو ان دونوں رستوں کی سمتیں آخر میں الگ ہو جاتی تھیں اور اس کا رستہ مشرق کو جاتے ہوئے شمال کی جانب مڑ جاتا تھا۔ اور لڑکی کا رستہ جنوب کو مڑ جاتا تھا۔ لیکن یہ دسویں کوس کی بات تھی۔ دس کوس تک وہ دونوں ساتھ چلیں گے۔ الگ الگ لیکن ساتھ ساتھ۔ سارے رستے میں دور دور تک اور کوئی مسافر نظر نہیں آتا تھا۔ اس سے بھی عبدل کے دل میں ایک عجیب سی گدگدی پیدا ہوئی اور وہ سوچنے لگا جیسے اس میٹھی، مہربان، غنودگی سے لبریز وادی میں دونوں بیکہ اکیلے ہیں۔ جیسے یہ وادی قدرت نے ان دونوں کے لئے بنائی ہے۔ جیسے اب اس وادی میں ان دو مسافروں کے علاوہ اور کوئی نہیں آسکتا اور گو نچلے راستے پر اکثر مقامات پر آبادی آجاتی تھی۔ گھر اور مویشی چرواہے اور کھیتوں میں کام کرنے والے لوگ تھے۔ یہ لوگ اپنی منزل پر تھے جو منزل کی تلاش میں آگے نکل جاتے

ہیں۔ ان کے لئے عبدل کے دل میں رشک و رقابت کے جذبات بیدار نہیں ہو جاتے لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ نچلے رستے پر کوئی دوسرا مسافر کسی رستے کے گاؤں سے نکل پڑے اور لڑکی کے ساتھ ساتھ چلنے لگ پڑے یہ اسے کبھی گوارہ نہ ہوگا۔ ہر گاؤں کے قریب آتے ہی عبدل کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا اور جب وہ گاؤں پیچھے رہ جاتا اور لڑکی اکیلے اپنے راستے پر چلی جاتی تو اسے اطمینان سا ہو جاتا اور وہ پھر اپنے رستے پر آگے بڑھ جاتا۔ گو راہ سے اب تک سات کوس ہو چکے تھے اور وہ دونوں اکیلے اکیلے اپنے رستے پر جا رہے تھے۔ اس امر سے عبدل بہت مطمئن تھا لیکن یہ سوچ کر بہت بے چین تھا کہ اب تک اس نے لڑکی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ شہری لڑکوں کی طرح اس کے دل میں کسی قسم کی جھجک تھی۔ وہ گاؤں میں پلا بڑھا تھا جہاں مرد اور عورتیں، لڑکے اور لڑکیاں بے تکلفی سے ایک دوسرے سے بات چیت کر لیتے ہیں۔ لیکن پتہ نہیں یہاں کیا بات تھی۔ اس نے لڑکی سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن لڑکی نے اس سے کوئی بات نہیں کی اس بات سے اُسے بڑا رنج اور غصہ تھا۔ پہلے تین چار کوس تو خیر مجبوری تھی کیونکہ گو راہ کے فوراً بعد ہی یہ دونوں راستے جو ایک دوسرے کے اس قدر قریب آ گئے تھے۔ ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے اور ان کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہی گیا۔ حالانکہ وہ خود پہاڑ کی چوٹی کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں اتنے دور سے تو کیا بات ہوئی۔ ہاں چلا کر ایک دوسرے کا نام ضرور پوچھا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا۔

عبدل نے زور سے چلا کر پوچھا۔ "او گھیلے گھیلے چلنے والے کھواں چلی ڈاڈ پگڈنڈی پگڈنڈی جانے والی لڑکی تو کہاں چلی۔؟) عبدل کی آواز آس پاس کے پہاڑوں میں گونج گئی اور یہ گونج پلٹ کے قریب کے پہاڑوں کے پاس آتی گئی۔ پہاڑوں نے اپنے چوڑے

چکلے سینوں کی گرج دار آواز نے بار بار پوچھا۔

او ہیلے ہیلے والئے کھوال جُلی

نیچے وادی کی پگڈنڈی پر چلنے والی لڑکی چونک گئی اس نے آواز کے رخ چاروں طرف دیکھا کیونکہ یہ گونج چاروں طرف سے پیدا ہو رہی تھی۔ جیسے یہ چھوٹی سی وادی اور اس کے دیوتا خود لڑکی سے ہم کلام ہو رہے تھے۔ پھر لڑکی کی نگاہیں گھاٹی کی چوٹی پر گھوم گئیں جہاں سفید سفید بادلوں کے نیچے ایک لانبے قد کا نوجوان لڑکا کھڑا تھا۔ عبدل نے اپنا سوال پھر دہرایا۔

لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا۔ جانے یہ اجنبی کون تھا۔ وہ کیوں کسی کے سوال کا جواب دے۔ اب تک وہ اپنے راستے پر دھیرے دھیرے چل رہی تھی۔ اب لڑکی کے قدم تیز تر ہوتے گئے۔ جسے دیکھ کر اب عبدل کو بھی اپنے قدم تیز کر دینے پڑے عبدل لڑکی کے جواب دینے پر چپ ہو گیا۔ اس کا رستہ بہت دور تھا۔ اور وہ بے کار میں اتنی بلندی پر سے چلا چلا کر اپنے گلے کا ستیاناس کر رہا تھا۔ وہ چپکے سے اپنے رستہ پر چلتا گیا۔ اگلے کوس کے بعد اس کا رستہ نیچے ڈھلوان کو جانے لگا۔ یعنی لڑکی کے راستے کے قریب ہونے لگا۔ قریب ہوتے ہوتے یہاں تک قریب ہوا کہ اب وہ لڑکی کے رخ پر لہراتی ہوئی زلف کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی سرخ سوسی کی قمیض اور شلوار پر چھینٹ کے سفید پھولوں کو گن سکتا تھا۔ اس کی چھاتیوں کے زیر و بم کی دھمک کو محسوس کر سکتا تھا۔ لڑکی کو معلوم تھا کہ اب وہ اس کے بہت قریب اوپر گھاٹی کے راستے پر چل رہا تھا پھر بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کیوں دیکھے، کسی اجنبی کی طرف کیوں دیکھے۔ کیوں کسی سے بات کرے۔ لڑکی کے قدم تیز ہوتے گئے۔ عبدل نے مسکرا کے اپنے پاؤں کی ایک ہلکی

سی ٹھوکر سے ایک چھوٹا سا پتھر نیچے لڑھکا دیا۔ پتھر سبزے پر لڑھکتا ہوا چیل کے ایک تنے سے آٹکرایا۔ وہاں سے اچھل کر نیچے پگڈنڈی پر لڑکی کے سامنے آن پڑا۔ لڑکی ٹھٹھک گئی اس نے غصّے کی نگاہوں سے عبدل کو دیکھا۔ عبدل مسکرایا۔ لڑکی نے منہ پھیر لیا۔ عبدل نے ایک اور پتھر لڑھکایا۔ لڑکی چھلانگ مار کے آگے بڑھ گئی اور اپنے راستے پر دوڑنے لگی۔ عبدل ہنسنے لگا۔ سرخ شلوار، سرخ قمیض اور گلابی چہرہ' عبدل تک بندی کرتے ہوئے گانے لگا۔

سُرخ پھول گلاب دا ٹُلیدا گیلے گیلے

رُسیا رُسیا ٹُردا چلدا بیلے بیلے

(سُرخ پھول گلاب کا پگڈنڈی پر چل رہا ہے۔ روٹھا روٹھا چل رہا ہے۔ جلدی جلدی......)

لڑکی نے گھوم کے عبدل کی طرف دیکھا اور جھنجھلا کے ایک پتھر کھینچ کے مارا عبدل فوراً جھاڑی کے پیچھے چھپ گیا۔ پتھر چیل کے ایک تنے سے ٹکرا کے واپس نیچے پگڈنڈی پر جا گرا۔ عبدل جھاڑی کے پیچھے سے نکلتا ہنستا ہوا قہقہے لگاتا ہوا۔ گاتا ہوا۔

پتھر مار کے چنّا رُس جانا

اس کی آواز دور ہوتی گئی کیونکہ اس کا راستہ پھر اوپر جا رہا تھا۔ عبدل نے سوچا۔ کتنی بد مزاج لڑکی ہے۔ نہ گانا جانتی ہے نہ باتیں کرنا۔ سفر میں اگر آدمی باتیں کرتا جائے یا اپنے رفیق کے گانے کے بولوں کا جواب دیتا جائے تو سفر کتنے مزے سے کٹ جاتا ہے۔ شاید یہ لڑکی پہلی بار گھر سے کہیں باہر جا رہی ہے۔ شاید بہت مغرور ہوگی۔

اور مغرور ہونے کی وجہ تو سمجھ میں آتی ہے۔ عبدل نے سوچا۔ پھر اس نے سوچا۔ مگر ایسا بھی کیا۔ سات کوس تک وہ دونوں اکٹھے آمنے سامنے چلتے رہے اور وہ منہ سے ایک لفظ تک نہ کہہ سکی آخر ہم بھی انسان کی اولاد ہیں۔ کوئی وحشی نہیں ہیں۔ عبدل نے جھولے کو ٹھیک کر کے آگے دیکھا تو لڑکی بہت آگے نکل چکی تھی اس نے درخت کے تنے کا سہارا چھوڑ دیا اور اپنے راستے پر ہولیا۔

اگلے دو کوس تک عبدل نے کسی قسم کی کوئی کوشش نہ کی وہ چپ چاپ اپنے رستے پر چلتا رہا۔ ان دو کوسوں میں اس کا رستہ کئی بار نیچے آیا اور اوپر گیا۔ پھر نیچے آیا لیکن وہ اپنی راہ پر چلتا رہا۔ ایک دفعہ تو دونوں رستوں میں صرف چند گز کا فاصلہ رہ گیا پھر بھی عبدل نے لڑکی کی طرف دیکھنے یا اس سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خاموشی سے راستے پر چلتا گیا۔ دو کوس گذر گئے۔ اب یہ آخری کوس تھا۔ ساتھ ساتھ چلنے والی دونوں پگڈنڈیاں۔ اس کوس کے آخری قدموں پر ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گی۔ ایک شمال کو جائے گی دوسری جنوب کو جائے گی۔ عبدل کے دل میں ایک عجیب بے کلی پیدا ہو گئی۔ اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے برسوں کے جانے پہچانے ہم سفر سے الگ ہو رہا ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور جوں جوں وہ منزل قریب آتی گئی۔ اس کے قدم سست پڑتے گئے۔

لڑکی کے چلنے کی رفتار بھی دھیمی پڑ گئی تھی۔ پچھلے دو کوس میں اس نے کئی بار کنکھیوں سے عبدل کو دیکھا تھا اور عبدل کو خاموش اور اداس پا کر اس کے دل کو جھٹکا سا لگا۔ کہیں سے کوئی بجلی کی رَو دوڑتی ہوئی آتی تھیں اور اس کے جسم کا ذرہ ذرہ اس کے حرارت آمیز لمس سے سنسنا اٹھتا تھا۔ یکایک وہ اپنے رَو میں بیدار ہوئی اور لہو کا طوفان اس

کی آہستہ خرامی کا وجد آمیز لوچ ایک گہری اداس تھکن میں کھو گیا۔ اس نے پہلی بار کیسے عجیب حسرت آمیز انداز سے عبدل کو دیکھا۔

عبدل رک گیا

لڑکی بھی رک گئی۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔

پھر لڑکی کی گہری پلکیں آہستہ سے اس کے رخساروں پر جھک گئیں جیسے شفاف چشمے کے اوپر بادلوں کا سایہ آجائے۔ عبدل نے گھبرا کے منہ پھیر لیا۔ اور شمال کی جانب مڑ گیا۔ لڑکی وہیں پتھر پہ بیٹھی تھی۔

عبدل کا رستہ شمال کو جاتا تھا۔ شمال کو جہاں اخروٹ کے درختوں میں شہد کے چھتے لگے ہیں اور جھاڑیوں پر سرخ گرچ چمک رہے ہیں۔ شمال کو جہاں بیار کے تناور درخت سپاہیوں کی طرح افق پر پہرہ دے رہے ہیں اور آسمان پر شفاف بادل اونچے اونچے قلعے بناتے ہیں۔ شمال کو جہاں برفیلی ہوائیں تیز و تند جھکڑ اور آندھیاں لئے اڑتی ہیں اور کاغان کے کنارے وہ چنار کھڑا ہے جہاں آج سے کئی سو سال پہلے جہانگیر اور نورجہاں نے محبت کی اُمنگ دیکھی تھی۔ عبدل کا رستہ شمال کو جاتا تھا جہاں اس کا گھر تھا۔

لڑکی وہیں پتھر پہ بیٹھی تھی

عبدل شمال کو جا رہا تھا اور اس کے گلے میں ایک رسی تھی جو اسے پیچھے کھینچ رہی تھی۔ اور اس کے پاؤں میں ایک ایک من کے پتھر بندھے تھے۔ اور زمین تلے ایسا مقناطیس لگا تھا جو اسے آگے بڑھنے سے روک رہا تھا۔ پھر بھی عبدل گھاٹی کے اوپر چڑھتا گیا۔

لڑکی بہت دیر تک چپ چاپ پتھر پہ بیٹھی رہی۔ جب عبدل درخت کے گھنے

جھنڈ میں غائب ہو گیا تو وہ وہاں سے اُٹھی اور ہولے ہولے قدموں سے اپنے راستے پر چلنے لگی - اب دوپہر ڈھل رہی تھی - کوئی دو کوس کا فاصلہ اور ہو گا - اور پھر وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ جائے گی جو نگرا کے اگلے جنگل میں لکڑیاں چیرنے کا کام کرتا تھا - جب وہ گوراہ سے چلی تھی تو کتنی خوش تھی - اس کی ماں نے اپنے خاوند کے لئے اپنی بیٹی کے ہاتھ گڑ بھیجا تھا - اور چائے اور نمک اور سوڈا اور ایک چاپی کے لٹھے کی کوری قمیض - اس کا باپ اس قمیض کو پہن کر کتنا خوش ہوگا - لڑکی نے اپنی چادر کے کنارے سے بندھی ہوئی چیزوں کو اپنے ہاتھ سے چھوا اُس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی آئی لیکن ابھی اس کے چہرے پر ایک حسرت آمیز خلش اور پریشانی سی باقی تھی - جس نے اس مسکراہٹ کو اچھی طرح سے کھلنے نہیں دیا - وہ اچھی طرح سے سمجھ بھی نہ سکی تھی کہ وہ کیوں اس نوجوان کو اپنے راستے پر جاتے ہوئے دیکھ کر اداس ہو گئی - وہ اپنے گھر جا رہا ہوگا جیسے وہ اپنے باپ سے ملنے جا رہی تھی - پھر وہ کیوں اداس ہو گئی - کیوں اسے دیکھ کر ایسا ہوا جیسے اس کے تن بدن کے روئیں روئیں میں بھنور سے پڑنے لگے - یہ گرداب کیسے ہوتے ہیں جب سارا بدن ٹوٹنے لگتا ہے اور ہاتھ پاؤں ایسے ڈھیلے ہو جاتے ہیں کہ رستے پر چلنا دوبھر ہو جاتا ہے جب وہ چھوٹی سی تھی تب تو ایسا نہیں ہوتا تھا - اب . . . . . اور اب . . . . وہ نوجوان اس کے ساتھ پیچھے پیچھے کیوں نہیں آیا -

اسے ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی زندگی میں، اس کے جسم میں، اس کی روح میں کہیں کوئی کمی رہ گئی ہے - نامکملیت کا احساس -

لیکایک لڑکی نے اپنے پیچھے مڑ کے دیکھا - دُور سے عبدل چلا آ رہا تھا - اس کے رستے پر، اپنا رستہ چھوڑ کے، اس کے رستے پر - لڑکی کا دل دھک سے رہ گیا - اس کے دل کے خوابیدہ خوف جاگ اُٹھے - خوف بھی اور خوشی بھی، آرزوؤں کی کونپلیں اور امنگوں کے

مرغزار، ننھے ننھے پھول، یہ ہری بھری کیاریاں کیا سب اس کے دل میں چھپی بیٹھی تھیں۔ لڑکی حیران رہ گئی۔ پھر اس کے دل میں کسی بے نام سے گزند کا خیال سانپ کے پھن کی طرح لہرانے لگا اور وہ تیز تیز قدم اُٹھانے لگی۔

لیکن عبدل آہستہ آہستہ سر جھکائے اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ وہ چاہتا تو دوڑ کے اُسے پکڑ سکتا تھا۔ لیکن اس نے اسے پکڑا نہیں۔ گو اُسے قدم بار بار آگے کھینچ کے لے جاتے تھے لیکن وہ انھیں روک کر آہستہ آہستہ لڑکی کے پیچھے کافی فاصلہ رکھ کے چل رہا تھا۔ یہ لڑکی اسے شمال سے جنوب کو کھینچ لائی تھی۔ اس طرح کہ اب اسے اپنے گھر کا سفر بے کار معلوم ہو رہا تھا۔ بالکل بے مصرف، جیسے کوئی دن سے سورج اور رات سے اس کے تارے چھین لے۔ وہ بالکل اسی طرح محسوس کر رہا تھا۔ اسی لئے تو شمال سے جنوب کو پلٹ آیا تھا وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ سفر کہاں ختم ہوتا ہے۔ یہ سُبک قدم اسے کہاں لے جاتے ہیں یہ سُرخ پھول کس وادی میں کھلتا ہے ....؟

وہ لڑکی کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ لڑکی آگے بڑھتی گئی کیونکہ راستہ اُسے معلوم تھا لیکن کیا یہ وہی رستہ تھا۔ کیا یہ نیا رستہ نہیں تھا۔ لڑکی کی نگاہوں میں ہر چیز نئی معلوم ہو رہی تھی۔ پگڈنڈی کے کنارے کے جنگلی پھولوں نے اس طرح حیرت سے آنکھیں کھول کر اس کی طرف یوں نہ دیکھا تھا۔ پیڑوں کی گداز شاخیں شفقت آمیز انداز میں اس پر جھکتی جا رہی تھیں اور اس کی مہکی ہوئی ہواؤں میں میٹھی میٹھی سرگوشیاں تھیں اور اب تو پاؤں کے نیچے آنے والے چھوٹے چھوٹے نیلے پتھر اس کے تلوؤں کو گدگدا کر الگ ہو جاتے، شریر پتھر.... اس کا جی لیکایک ناچنے کو چاہنے لگا مگر وہ اپنی خواہش کو دل ہی دل میں دبا کر آگے بڑھ گئی ---!

اب رنگڑ کا جنگل شروع ہو گیا۔ جہاں اس کا باپ کام کرتا تھا یہاں سے پگڈنڈی وادی کے پلو کو چھوڑ کر اوپر جاتی تھی۔ راستے میں جگہ جگہ درخت گرے پڑے تھے اور کٹی ہوئی جڑوں کے سرخ ٹھنٹھر نمایاں نظر آتے تھے۔ کہیں پر آدھے چھلے ہوئے تنے تھے۔ کہیں پر بڑی بڑی گیلیاں اور شہتیر اور چھوٹی چھوٹی شہتیریاں، لڑکی نے مڑ کر عبدل کی طرف دیکھا۔ دوسرے لمحے میں وہ گھاٹی کے اوپر چڑھتی گئی۔ عبدل دیر تک نیچے کھڑا رہا۔ جب وہ کافی دور تک اوپر چلی گئی تو وہ اپنی جگہ سے ہلا۔ اوپر چڑھتے چڑھتے لڑکی گھاٹی کی چوٹی کے گھنے جنگل میں غائب ہو گئی اور عبدل ایک لمحے کے لئے پریشان سا ہو گیا۔ پھر وہ سمت دیکھ کر جدھر لڑکی غائب ہوئی تھی۔ ادھر مڑ گیا لیکن ابھی اسے کافی فاصلہ طے کرنا تھا۔

گھاٹی کے اوپر چڑھ کے اس نے دیکھا تو لڑکی اسے کہیں نظر نہ آئی۔ سامنے گھنے جنگل کے بیچ میں بہت سے درختوں کو گرا کر جگہ صاف کی گئی تھی۔ یہاں ایک ٹیالے رنگ کا ایک خیمہ تنا تھا اور ایک جھونپڑی چھتی تھی۔ چار آدمی ایک بڑے آرے پر کام کرتے ہوئے چیل کے ایک تنے کو چیر رہے تھے۔ ان کے آگے مشرق کی طرف ڈھلوان تھی جہاں شہتیروں کو ایک دوسرے کے نیچے ڈال کے لکڑیوں کی گھیس بنائی تھی۔ یہ نیل نما گھیل بنائی تھی۔ یہ نیل نما گھیل ترچھے انداز میں گھومتی ہوئی گھاٹی کی دوسری جانب نیچے ندی میں چلی گئی تھی کاغان کی ندی جس کا شفاف پانی اپنی رنگت اور پاکیزگی میں آسمان کو بھی شرماتا تھا۔

لیکن لڑکی کہیں نظر نہ آئی۔

عبدل آگے بڑھ آیا۔ مزدوروں نے آرے پر کام کرنا چھوڑ دیا اور اس کی طرف غور سے دیکھنے لگے۔ عبدل نے ایک لمحہ کے لئے اپنا دایاں پاؤں اپنے بائیں پاؤں سے کھجایا اور پھر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ آیا۔

ایک پستہ قد کا چوڑا چکلا آدمی جس کے سینے پر سُرخ بال تھے جس کا سر گھٹا ہوا تھا اور جس کی آنکھیں گہری نیلی تھیں۔ دو قدم آگے بڑھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کولھوں پر تھے اور اس نے عبدل کو سر سے پاؤں تک گھورا۔ پھر بولا۔

"شہر سے آئے ہو۔؟"

عبدل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تمہیں لالہ گیان شاہ ٹھیکہ دار نے بھیجا ہے یہاں۔؟"

عبدل نے انکار میں سر ہلا دیا۔

موٹے تازے پستہ قد آدمی نے پہلی بار اطمینان کا سانس لیا۔ مسکرا کے بولا۔ تو ادھر جنگل میں کیا کام کرنے آئے ہو۔ شہد کے چھتے توڑنے آئے ہو جنگلی ریچھوں کی طرح؛

وہ ہنسا اور اس کے ساتھ اس کے تینوں ساتھی بھی ہنسے۔ ایک جس کا قد لمبا تھا اور جس کے سر پہ گول اور بھوری ٹوپی تھی۔ ایک وہ جو بہت دبلا تھا اور جس کے ہاتھوں کی انگلیاں بڑی لمبی تھیں اور جو ایک خاکی نیکر اور پھٹی ہوئی قمیض پہنے تھا۔ اور ایک وہ جو ذات کا گوجر دکھائی دیتا تھا جو سانولے رنگ کا تھا اور جس کے بڑے بڑے دانت تھے اور کاسنی رنگ کے مسوڑھے اور جس کی ہنسی سب سے زیادہ اونچی تھی۔

عبدل بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گیا۔ پھر عبدل نے کہا وہ راستہ بھول گیا ہے۔ وہ دراصل کاغان جا رہا تھا۔ مگر رستہ بھول کے ادھر چلا آیا۔

پستہ قد کا مضبوط آدمی پھر زور سے ہنسا اور اس نے بلند آواز میں کہا۔

"کاغان تو ادھر ہے۔" اور دائیں ہاتھ سے دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"اور تم ادھر آ گئے۔"

عبدل نے کہا۔ "غلطی ہوئی۔ چار سال کے بعد شہر سے آرہا ہوں۔ اسی لئے راستہ بھول گیا۔"

تو آج یہیں رہو۔ آج تم واپس نہیں جا سکتے۔ اب سہ پہر بھی ڈھل رہی ہے۔ واپس جاتے تمہیں رات پڑ جائے گی اور تم مشکل سے سرکاری رکھ تک پہنچ سکو گے۔ اور رات کے وقت کوئی آدمی کا بچہ اس رکھ کو پار نہیں کر سکتا۔ چیتے اور ریچھ اور بھیڑیئے... جانتے ہو؟ عبدل بولا یہ تو ٹھیک ہے۔ عین اسی وقت اس نے لڑکی کو جھونپڑے میں کھڑے دیکھا۔

(۲)

سہ پہر کے آخری لمحے تھے۔ جب عبدل چونک کے جاگا۔ وہ وہیں زمین پر لکڑی کے ٹھنڈے بُرادے کے ڈھیر پر سو گیا تھا۔ ایسے اطمینان سے جیسے وہ اپنے گھر بستر پر سو رہا ہو اور جب وہ جاگا تو سورج کی آخری کرنیں جنگل کے بیچ میں اس کھلی جگہ پر پڑ رہی تھیں جہاں ابھی تک آرہ چل رہا تھا۔ کاؤ کی مضبوط صلیب نما کھمبیوں کے درمیان دیودار کی ایک مضبوط گیلی ترچھی کھڑی تھی۔ ایک صلیب اوپر تھی، ایک نیچے۔ آرے کا ایک سرا اوپر تھا ایک نیچے۔ اوپر کی صلیب پر شہتیر قد کا مضبوط کشمیری کھڑا تھا اور اس کے ساتھ میں وہ سانولے رنگ کا گوجر تھا۔ دوسری صلیب کے نیچے وہ لمبا تڑنگا ٹوپی والا آدمی تھا اور اس کے ساتھ میں لمبی لمبی انگلیوں والا دُبلا پتلا مزدور جس کی قمیض جگہ جگہ سے پھٹ چکی تھی۔ ہُلا کی آواز سے آرہ جاتا اور ہُو کی آواز سے نیچے آتا اور اس ہلا اور ہُو کی لے پر دیودار کی گیلی کو آرہ چیر رہا تھا۔ اور ہلکا ہلکا برادہ نیچے گرتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف دیودار بیاڑ چیل، دیار، کاؤ اور تنگ کے درخت کھڑے تھے۔ سورج کی آخری کرنیں چیل کے

جھونپڑوں اور دیوار کے چھتناروں سے چھن چھن کر فرش پر گر رہی تھیں اور لکڑی کا برادہ سونے کے ذرّوں کی طرح چمک رہا تھا۔ یہ چمک تیز چلتے ہوئے آرے پر تھی۔ دیوار کی گیلی پر تھی۔ جس کے سینے سے سوتے کا غبار چھن رہا تھا۔ مزدوروں کے ایک مخصوص لے پر حرکت کرتے ہوئے ہاتھوں میں تھی اور ان کی باہوں کی اُبھری ہوئی مچھلیوں کی گردش اور مضبوط پنڈلیوں کی نسوں کی ہر تان میں اور گرم سانسوں سے ڈولتی ہوئی چھاتیوں کی ہر گردش میں ایک ایسے رچے ہوئے آہنگ کی پکار تھی جیسے وہ اپنے ہاتھ میں لوہے کا آرہ نہیں محنت کا ستار لئے گا رہے تھے۔

عبدل ایک عرصہ تک محویت کے عالم میں اس منظر کو دیکھتا رہا۔ پھر جب سورج کی آخری کرنیں پستہ قد کشمیری کے ماتھے کو چھو کر اوپر درخت کی ڈالیوں میں چلی گئیں تو مزدوروں نے آرہ چلانا بند کر دیا اور اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے عبدل کے پاس لکڑی کے برادے کے ڈھیر کے قریب آ بیٹھے۔

پستہ قد کشمیری نے اس سے پوچھا "تم شہر میں کیا کام کرتے ہو۔؟"

"اسکول میں پڑھاتا ہوں۔"

"تمہارا نام کیا ہے۔؟"

"عبدل۔!"

"کتنی جماعت پڑھے ہو۔؟"

"اسٹھ۔!"

"آٹھ۔"

"تو انگریزی بھی پڑھے ہو گے۔؟"

"ہاں۔"

مزدوروں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں صلاح مشورہ کیا۔ آخر لانبے قد والے آدمی نے جس کا نام بعد میں عبدل کو ولی جو معلوم ہوا۔ پستہ قد آدمی سے کہا۔ دکھا دے قادر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ کیوں کرم داد تمہاری کیا صلاح ہے؟"

کرم داد جو سانولے رنگ کا گوجر تھا۔ بولا۔ ٹھیک تو ہے۔ پتہ چل جائے گا۔ نورے کی بھی صلاح لے لو۔

یہ دُبلے پتلے لانبی انگلیوں والے آدمی کی طرف اشارہ تھا۔ وہ اکڑوں بیٹھا تھا اور اپنی لانبی انگلیوں سے ٹھوڑی کو سہلا رہا تھا اور عبدل کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اس نے آدھے شبہے اور آدھے یقین کے انداز میں دیکھا۔ "اچھا تو دکھا دو۔"

جب نورے سے کرم داد اور ولی جو کی صلاح ایک ہوئی تو پستہ قد قادر بٹ نے اپنی میلی کچیلی قمیض کی جیب سے ایک کاغذ نکالا جو کئی تہوں میں بند تھا۔ کاغذ کبھی سفید رنگ کا ہوگا لیکن متواتر جیب میں پڑے رہنے سے بھورے رنگ کا ہو گیا تھا۔ اور تہوں کے قریب سے پھٹتا جا رہا تھا۔

قادر بٹ نے وہ کاغذ بڑی احتیاط سے نکال کے عبدل کے ہاتھ میں دیا اور کہا۔ اسے پڑھو۔

عبدل بھورے رنگ کے کاغذ کی تہیں کھولنے لگا۔ اس کاغذ سے آدمی کے پسینے اور مکئی کے برادے کی بو آ رہی تھی۔ تہ در تہہ کھولنے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ یہ کاغذ ریاست کے وزیر صاحب کے دفتر سے لالہ گیان شاہ ٹھیکیدار جنگلات کے نام جاری کیا گیا ہے۔

جس میں منجملہ دوسری باتوں کے یہ لکھا تھا کہ لکڑی کی کٹائی کرنے والے مزدوروں اور آرہ چلانے والے مزدوروں اور لکڑی کی گھسل پر کام کرنے والے مزدوروں کو آٹھ آنے یومیہ کے حساب سے اُجرت دی جائے گی۔

"سور کا بچہ۔" قادر زور سے چیخا اور زور زور سے اپنی چھاتی کوٹنے لگا۔ سور کا بچہ یہاں آیا اور زندہ واپس چلا گیا۔

دُبلے پتلے آدمی کی بھی انگلیاں بڑی بے چینی سے اپنی ٹھوڑی کو چھو رہی تھیں۔ عبدل نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"کیا بات ہے؟" لانبے قد کا ولی جُو بولا۔ وہ بہت غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ لالہ گیان شاہ کا سالا ہم کو چھ آنے مزدوری دیتا ہے اور ادھر کاری پرچے (اس نے بھورے کاغذ کو تھپتھپایا) ادھر سرکاری پرچے میں لکھا ہے ہم کو آٹھ آنے مزدوری ملنا چاہیئے۔

"ہائے ہائے۔" قادر بٹ نے جھلّا کے کہا۔ "وہ سالا گیان شاہ اور اس کا آدمی ادھر آیا بھی اور زندہ چلا گیا۔"

عبدل نے پوچھا۔ "تمہیں یہ کاغذ کب ملا؟"

"ارے ہمیں کون دیتا تھا۔" نورے نے غصے میں کہا۔ اور اس کی آنکھیں سبز دکھائی دینے لگیں۔ بلّی کی طرح یہ کاگج تو لالہ کے آدمی دھرم چند کی جیب سے گر پڑا تھا۔ اتنا کہہ کے نورے نے بڑے غصے سے کاغذ کو تھپتھپایا۔

قادر نے کہا۔ "ارے کیا کرتے ہو۔ کاغذ پھٹ جائے گا۔ اس نے عبدل کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا۔ اور بڑی احتیاط سے اسے تہہ کرنے لگا۔

کرم داد بولا۔ اب کاغذ کس کا۔ لالہ تین مہینے کی مزدوری تو دے گیا اور رسید بھی لے گیا۔

قادر بولا۔ ابھی تین مہینے کام باقی ہے۔ اس کے باپ سے بھی اپنی مجوری نہیں چھوڑیں گے۔ یہ سرکاری کاگج ہوہے۔ قادر نے اتنا کہہ کے کاغذ بڑے اطمینان سے جیب میں رکھ لیا۔

عبدل نے پوچھا۔ تم نے رسید دیکھی تھی؟ اگر اس نے آٹھ آنے کے حساب سے مجوری لکھوائی ہو تو۔

تو اس کی بے ایمانی کو کیا کریں گے۔ اپنا اپنا مقدر ہے۔ ہم نے تو انگوٹھا لگا دیا ہم کوئی اکھر تھوڑے ہی پڑھتے ہیں تیری طرح۔ دلی جو نے چمک کر کہا۔

قادر بٹ نے اپنے سینے پر ہاتھ مار کے کہا۔ روتا کیوں ہے۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔ اب کے لالہ کو آنے دو۔

وہ سب چپ ہو گئے۔

کرم داد بولا۔ تھوڑی گہلیاں رہ گئی ہیں۔ انہیں ڈھال پہ اُتار دیں۔

نورا بولا۔ مرتا کیوں ہے۔ صبح دیکھا جائے گا۔

قادر بولا۔ نہیں کام تو ٹھیک ہوگا۔ اور پھر ابھی کھانے میں دیر ہے۔ چائے پی کے یہ گہلیاں نیچے پھینک دیتے ہیں۔ اس میں رکھا گیا ہے۔؟

اتنا کہہ کے اس نے آواز دی۔ بانو۔۔۔۔ بانو۔۔!

عبدل نے دیکھا کہ وہ لڑکی جھونپڑے کے سامنے کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے۔ جی ابا۔

چائے -!

ہاں ابا - لاتی ہوں ابھی -

قادر نے خوشی سے اپنے ہاتھ ملے اور اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں کی پتلیوں کو گھما کر بولا میری بیٹی گاؤں سے بڑی اچھی چائے لائی ہے - کشمیری چائے اور نمک اور گڑ - آج مدت کے بعد چائے پینے کا مزہ آئے گا -

تھوڑی دیر کے بعد بانو سب کے لئے باری باری سے مٹی کی رکابیوں میں چائے لائی - چائے پہلے مہمان کو پیش کی گئی - پھر قادر ابا کو، پھر دوسرے ساتھیوں کو - عبدل نے پہلے ہی گھونٹ میں محسوس کیا کہ چائے بڑی مزیدار ہے - کشمیری چائے جس میں نمک گڑ اور سوڈا پڑتا ہے جو قہوے کی طرح گرم ہو جاتی ہے اور گلاب کی طرح سُرخ - اس کا مزہ سب سے الگ ہی رہتا ہے - قادر بڑے مزے سے سڑو کے لگا لگا کے پینے لگا اور ہر گھونٹ کے بعد خوشی کا اظہار کرتا -

چائے پینے کے بعد وہ لوگ ڈھال پر چلے گئے - عبدل بھی ان کے ساتھ چلا گیا - جھونپڑی کے قریب سے گذرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ بانو چولہے میں مکی کے سوٹے سینک رہی ہے - چولہے پر جھکی ہوئی بانو نے اسے ایک لمحے کے لئے کنکھیوں سے دیکھا - وہ گلاب سے رخسار اب شعلہ تھے اور اس پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں - عبدل آگے بڑھ گیا -

ڈھال بہت لمبی تھی - گھاٹی کی چوٹی پر جہاں وہ کھڑے تھے - نیچے کاغان کی ندی کے کنارے ڈھلوان کے ساتھ ساتھ لکڑیوں کی ڈھال بنی ہوئی تھی - یہ ڈھال سینکڑوں چھوٹی چھوٹی شہتیریوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اُوپر نیچے رکھ کے بنائی گئی تھیں - اس فیل نما ڈھال

کے کنارے بڑی بڑی گیلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ تاکہ نیچے گراتے ہوئے شہتیر ڈھال کے ادھر اُدھر اچھل کر نہ گر سکے۔

"ہلا۔ ہو۔ شیرا" قادر نے بلند آواز سے کہا اور اسی لمحے لکڑی کے ایک بڑے شہتیر کو ڈھال سے نیچے لڑھکا دیا۔ شہتیر فیل نما ڈھال پر پھسلتا ہوا بڑی تیزی سے نیچے گرتا گیا۔ ڈھلان کے ہر موڑ پر جب وہ اوپر کی ڈھال سے نیچے کی ڈھال پر گرتا تو ایک بلند آواز پیدا ہوتی جیسے درخت کے گرنے یا سینکڑوں من کے پتھر گرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ شہتیر ڈھال پر پھسلتا ہوا چند لمحوں میں ندی کے کنارے سے اچھل کر پانی میں گر جاتا اور دھم کی آواز سے پانی اُوپر اُچھلا اور لہریں دور دور تک پھیل گئیں۔

ہلو۔ ہو۔ شیرا۔ کہہ کے وہ لوگ گیلیاں اور شہتیریاں نیچے لڑھکانے لگے۔ عبدل بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اندھیرا اتنا بڑھ گیا کہ اب ڈھال کے کنارے اور ندی کی سطح بھی نظر نہیں آتی تھی۔ صرف لکڑی کے ڈھال پر گرنے اور گونج کر نیچے گرتے جانے اور پھر پانی میں دھم سے گرنے کی آواز آتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد آخری گیلی بھی نیچے لڑھکا دی گئی اور مزدور اپنے جھونپڑے کو لوٹے۔

مکئی کی روٹی اور پیاز کی چٹنی کھا کے اور ٹھنڈا پانی پی کے سب نے اطمینان کا سانس لیا۔ نورے اور کرم داد نے جنگل کے بیچ کی کھلی جگہ کے چاروں طرف لکڑیوں پھیلا کے آگ سلگا دی تاکہ جنگلی جانور ڈر کے ادھر نہ آئیں۔ پھر وہ لوگ اکھٹے ہو کے آرے کے نیچے بیٹھ گئے۔ جھونپڑے میں بانو سب کو کھلا کے اب خود کھا رہی تھی۔

قادر نے لمبی جمائی لے کے کہا۔ مجھے تو اب نیند آ رہی ہے۔ میں تو اب خیمے میں چل کر سوتا ہوں۔

وہ اُٹھ کے چلا گیا۔

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔

پھر کرم داد نے پوچھا۔ عبدل تم کتنے بہن بھائی ہو۔

عبدل بولا۔ ہم دو بھائی ہیں۔ ایک بہن ہے۔

نورا بولا اور تمہاری شادی۔

ابھی نہیں ہوئی۔

ارے اتنے بڑے ہو گئے اور ابھی تک شادی نہیں کی۔ ولی جُوڑی حیرت سے کہنے لگا۔ ہمارے گاؤں میں تو بڑی جلدی جوان کی شادی کر دیتے ہیں۔

کرم داد نے نورے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" نورے سے پوچھو۔"

نورے نے ایک آہ بھر کے کہا۔" ارے یار کیا پوچھتے ہو! بیوی مُحبت یاد آتی ہے تین مہینے سے اکیلے اس جنگل میں پڑے ہیں۔

سب چپ ہو گئے۔

ولی جُوڑ نے بڑی دیر کے بعد کہا۔ میں بھی خیمے میں جا کے سوتا ہوں اور تم کرم داد۔؟

میں تو چاند نکلنے تک یہاں بیٹھوں گا۔ کرم داد نے کہا۔

میں بھی۔ نورا ایک آہ بھر کے بولا۔

عبدل نے مسکرا کے کہا۔ میں بھی بیٹھوں۔

ہاں ہاں۔ تمہیں کون سا پار جانا ہے۔ کاغان ہی تو جانا ہے۔

نورا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہولے ہولے گانے لگا۔

جنگل کی وحشی محبت کا گیت۔

ایک گلہری تھی ایک سانپ تھا۔

ایک بنفشے کا پھول تھا۔

ایک لکڑی چیرنے والا تھا۔ ایک اُس کے دل کی رانی تھی۔

محبت کی رات تھی۔

محبت کی رات تھی جب چاند نکلا۔

چاند عاشقوں کی زبان ہے۔

گلہری نے لکڑی چیرنے والے کے ناخن کاٹ لئے۔ سانپ نے رانی کو زہر دے دیا۔

بنفشے کے پھول نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

لکڑی چیرنے والا پاگل ہو کے بھاگا۔ آہ۔ آہ۔ آہ۔

سانپ نے پھن پھیلایا۔ گلہری نے قبر کھودی۔

رانی سو گئی۔ بنفشے کے پھول کی گود میں۔

چاند ڈوب گیا۔

آخر میں تورے کی آواز ڈوب سی گئی تھوڑی دیر کے لئے وہ خراٹے لینے لگا۔ عبدل نے دیکھا۔ اس کے قریب ہی کرم داد بھی سو گیا تھا۔ دونوں چاند کا انتظار کرنے والے اس کے آنے سے پہلے ہی سو گئے۔ دن بھر کی محنت سے تھکے اپنے دور گاؤں میں لینے والی بیویوں اور بچوں کے سنہری تصوّر لئے ہوئے سو گئے تھے اور ان کے سو جانے کے بعد چاند اس کھلی جگہ پہ آیا اور خیمے اور جھونپڑیاں اور آرے اور لکڑی کے برادے کے ڈھیر پر دودھ جیسی بے داغ چاندنی سیال بن کے پھیل گئی۔ اس سیگوں غبار کی ہلکی ہلکی

روشنی میں عبدل آہستہ سے اٹھا اور اس نے جھونپڑی کے سامنے لیٹی ہوئی بانو کے دھڑکتے ہوئے سینے پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

بانو نے کچھ نہیں کہا۔

اس نے اس وقت بھی کچھ نہیں کہا۔ جب عبدل نے اُسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اُٹھا کر اسے اپنے کانپتے ہوئے سینے کے ساتھ لگا لیا۔ بانو اس وقت بھی چپ رہی۔ جب وہ اس کے قریب ہی برادے کے ڈھیر پر گر گیا۔ وہ اس کے گرم سانس کا پیغام سُن رہی تھی اور ہولے ہولے اپنی مٹھیوں میں برادہ جمع کر کے اسے زمین پر گرا رہی تھی۔

عبدل نے ہولے ہولے اپنی گرم انگلیوں کی جنبش سے بانو کا رخ اپنی طرف پھیر لیا۔ اور اس کی ٹھوڑی کو اونچا کر لیا کہ بانو کی آنکھوں کی پتلیوں میں چاند چمکنے لگا اور اس کی گردن کا صحیح خم آرے کی دھار کی طرح چمکنے لگا۔ عبدل نے اس خم کے دونوں طرف ہاتھ رکھ دیئے اور بولا تمہارے باپ نے ٹھیک کہا تھا کہ میں یہاں شہد چکھنے آیا ہوں۔ اور اتنا کہہ کے عبدل نے اپنے ہونٹ بانو کے ہونٹوں پر رکھ دیئے۔ اور اس کی گرفت بانو کی گردن پر مضبوط ہو گئی۔ بانو نے اضطراب کے عالم میں اپنے ناخن عبدل کے شانوں میں گاڑ دیئے اور عبدل کی پیاسی آگ بانو کی روح کے گداز میں یوں ڈوبتی گئی۔ جیسے اب ان دونوں کے جسم برادے کے ڈھیر میں دھنستے جا رہے ہیں۔

یکا یک ایک زور کے جھٹکے سے بانو نے اپنے آپ کو عبدل کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ اس نے بالوں سے برادے کو جھاڑ کے الگ کیا اور اپنے ہونٹوں سے ایک باریک سی پھونک مار کے کہنے لگی۔ اونہہ۔ برادہ ہی برادہ ہے۔

عبدل ہنسا۔!

ششش۔ بانو نے انگلی اپنے پتلے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے کہا۔ اگر اس وقت ابا جاگ جائیں تو۔

تو مجھے مار ہی ڈالیں۔

ہاں۔ اس میں شبہ ہی کیا۔ بانو نے گردن جھٹکا کے کہا۔

مگر یہ لوگ ایسی کڑی مشقت کر کے سوئے ہیں کہ فجر سے پہلے ان کی آنکھ نہیں کھل سکتی

بانو نے اطمینان سے مسکرا کے کہا۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر۔ مگر تمہارا نام کیا ہے۔؟

عبدل نے مسکرا کر کہا۔ میرا نام عبدل ہے اور تمہارا نام بانو ہے۔

بانو نے پوچھا۔ تم کیا کام کرتے ہو۔

شہر پشتن میں اسکول میں پڑھاتا ہوں۔

پڑھاتے ہو؟ بانو اتنا کہہ کے تھوڑی دیر چپ رہی پھر آہستہ سے بولی۔

جہاں میری منگنی ہوئی ہے۔ وہ بھی شہر میں ہے۔ پولیس میں نوکر ہے۔ سنا ہے بڑا ظالم آدمی ہے۔

کیا نام ہے اس کا؟

کریم خاں۔ بانو نے آہستہ سے کہا۔ میرے ابا کو منگنی پر اس نے ساڑھے سات سو روپیہ دیا تھا۔ اب شادی میں پانچ سو روپیہ اور دے گا جب ہماری شادی ہو گی۔

کب ہو گی؟

اگلے سال بیساکھ کو وہ کہتا تھا مگر میری مرضی نہیں ہے۔

کیوں؟

اس کی شکل اچھی نہیں ہے۔ پھر بڑا ظالم معلوم ہوتا ہے۔

میری شکل کیسی ہے - عبدل بولا -

بانو ہنسی - اونہوں . . . . . .

اتنا کہہ کے اس نے لکڑی کا برادہ مٹھی میں بھر کے عبدل کے منہ پر پھینک دیا -

مگر عبدل اس سے پہلے ہی آنکھیں بند کر چکا تھا - اپنے چہرے سے برادہ صاف کرتے ہوئے عبدل نے کہا - شادی تو میری اور تمہاری ہو گی - لیکن میرے پاس منگنی کے ساڑھے سات سو نہیں ہیں - اور شادی کے پانچ سو بھی نہیں ہیں -

کیا تمہارے ماں باپ بہت غریب ہیں -

ہاں ہاں -

تو پھر تم کیسے اتنا پڑھ گئے ؟

اپنی لیاقت سے پڑھا ہوں - اپنی محنت سے -

آٹھ جماعتیں - بانو نے حیرت سے پوچھا -

عبدل نے سر ہلایا اور اب سکول میں پڑھاتے پڑھاتے اگلی دو جماعتیں بھی پڑھ چکا ہوں - اب گھر جا رہا ہوں - وہاں ابا - اماں سے مل کر چند روز کے بعد واپس شہر چلا جاؤں گا اور پھر وہاں سے راولپنڈی دس جماعتوں کا امتحان دینے جاؤں گا -

پھر تم کیا بن جاؤ گے -

پھر میں بڑا ماسٹر بن جاؤں گا - یا کون جانے تحصیل دار بن جاؤں گا -

تحصیل دار ؟ بانو کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں - پھر وہ عبدل سے الگ ہو کر بیٹھ گئی -

عبدل نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کمر کو پھر اپنی گرفت میں لے لیا - مگر بانو افسردہ بیٹھی رہی

بالکل بھی ہوئی ۔۔۔۔۔۔

عبدل بولا ۔ میرے پاس ساڑھے سات بھی نہیں ۔ پانچ سو بھی نہیں ہیں ۔ پھر بھی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔

بانو بولی ۔ یہ کیسے ہوگا ۔ ابا نہیں مانیں گے ۔ انہوں نے ساڑھے سات سو روپے میں دھان کے کھیت خریدے ہیں ۔ کھیت کسان کا بچہ کہاں چھوڑتا ہے ۔ پھر وہ رک کے بعد آؤ کہیں بھاگ چلیں ۔

مگر کہاں ۔ عبدل بولا ۔ مجھے تو ابھی راولپنڈی جانا ہے ۔ دسویں کا امتحان دینے ۔

ارے بھاڑ میں ڈالو دسویں کو ۔ بہت پڑھ لیا تم نے ۔ بانو بولی ۔

نہیں ۔ نہیں ! عبدل نے بڑی سختی سے کہا ۔

بانو چپ ہو گئی ۔

پھر عبدل بولا ۔ جب میں تحصیل دار ہو جاؤں گا ۔

کب ہو گے ؟

دو یا تین سال ! •

بانو جھنجھلا کے بولی ۔ اگلے بیساکھ تو میری شادی ہو جائے گی ۔

عبدل بولا ۔ کیا تم دو سال بھی نہیں ٹال سکتیں ۔ ؟ جو دل لگاتے ہیں ۔ وہ تو آخر دم تک نبھاتے ہیں ۔

بانو عبدل کے ساتھ چمٹ گئی ۔ کانپتے ہوئے بولی ۔ آؤ کہیں بھاگ چلیں ۔ مجھے اس پولیس والے سے بڑا ڈر لگتا ہے ۔ دو بیویاں اس کی پہلے مر چکی ہیں ۔

تم نہیں مرو گی ۔ عبدل نے بانو کو گلے سے لگا لیا ۔ اور کہا ۔ میں جب اپنے گھر

سے واپس آؤں گا تو یہاں سے تم کو لے کے شہر چلا جاؤں گا۔ بانو کا اُداس چہرہ کھل اُٹھا وہ اس کے کھردرے رخساروں پر نرم ہاتھ پھیرنے لگی۔ اور گنگنانے لگی۔

ایک لکڑی چیرنے والا تھا۔ ایک اس کے دل کی رانی تھی۔

محبت کی رات تھی۔

پھر وہ اطمینان کا سانس لے کر اس کی آغوش میں سو گئی اور بڑی دیر تک عبدل اس کی باہوں کو اپنے سینے سے لگائے سوچتا رہا۔ آخر وہ آہستہ سے اُٹھا۔ بانو کو اُٹھاتے ہوئے اس نے بڑی احتیاط سے خیمے کے آگے سے گزر کر بانو کو جھونپڑی کے اندر لٹا دیا۔ اور خود آرے کے نیچے آکر بیٹھ گیا۔

اس کے قریب الاؤ چمک رہا تھا۔ قریب ہی کرم داد اور نورا سوئے پڑے تھے کھلی جگہ کے چاروں طرف انگارے چمک رہے تھے۔ کہیں دور دور جنگل کی تاریکی میں انگارے سی چمکتی ہوئی آنکھیں نظر آجاتیں۔ کہیں دور گیدڑ چیخ اٹھتا اور دو چار بھیڑیئے ہو کر غل مچاتے۔ پھر چاروں طرف سناٹا چھا جاتا۔ ہوا کے جھونکے جیکن کی مہک سے بوجھل ہو جاتے۔ عبدل دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ اس نے چاند کو دونوں چیلوں اور آرے کے درمیان سے گذرتے ہوئے جنوبی سمت میں غائب ہوتے دیکھا۔ اس نے سات ستاروں کو ایک افق سے دوسرے افق کی جانب بڑھتے دیکھا۔ جب کہکشاں بھی ماند پڑنے لگی تو وہ کاغان کی ندی سے شور اور ہوا کے بڑھتے ہوئے جھونکوں کی سرگوشیاں سنتے سنتے وہیں سو گیا۔

چاول چور

راشن کی دکان پر دو طرح کے چاول تھے۔ چاول نمبر ایک، چاول نمبر دو۔ چاول نمبر ایک دیکھنے میں اُجلے تھے۔ دو نمبر چاول موٹے، بھدّے اور بھُورے تھے۔ اور ان میں سے چمڑے کی سی بُو آتی تھی۔

ترلوچن کی ماں کو اچھے چاول پسند تھے۔ اس لئے وہ دسترخوان پر بھُورے چاولوں کو دیکھ کر بہت بگڑی۔ بہو سے بولی۔ تم چاول لپکاتی ہو یا چپل کا تلہ کاٹ کے کھلاتی ہو۔ لے جاؤ ان چاولوں کو میرے سامنے سے .....

اس پر بہو نے کچھ کھسیا کر، کچھ گھبرا کر، کچھ لجا کر اپنے شوہر کی طرف دیکھا، پھر اپنی ساس کی طرف دیکھا اور پھر جلدی جلدی اُلجھے اُلجھے سانسوں میں بولی۔

"تو ماں جی! میں کیا کروں؟ جب راشن کی دکان پر جاتی ہوں۔ جب یہی دو نمبر چاول ملتے ہیں۔ نمبر ایک چاولوں کے لئے پوچھو۔ جب یہی کہتے ہیں۔ وہ چاول تو

ختم ہو گئے۔ یا اب کی نہیں آئے گی یا اگلی بار آئیں گے۔ وہ اگلی بار کب آتی ہے؟ کیا معلوم۔ اب میں کیا کروں؟ آپ کے لئے وہ لستی کی باسمتی کہاں سے لاؤں؟

لستی کی باسمتی پر تو لوچن کی ماں چونک اٹھی۔ گو بہو کا لہجہ نرم اور ریشم میں لپٹا ہوا تھا پھر بھی اس کے آخری نوکیلے فقرے کی دھار نے ماں کے دل پر چوٹ پہنچائی۔ کیونکہ ماں موضع لستی کوہ مری کی رہنے کی رہنے والی تھیں۔ جہاں اس کے شوہر جسونت سنگھ کی ایک چھوٹی سی زمینداری تھی۔ سردار جی کے انتقال کے دو برس بعد تک یہ زمینداری ماں کے قبضہ میں رہی۔ پھر ملک تقسیم ہو گیا اور پاکستان بنا اور ماں کو فسادات کے دنوں میں لستی سے بھاگ کر بمبئی آنا پڑا۔ ماں کو اپنا گھر اور اپنی زمینداری چھوڑنے کا اتنا غم نہ تھا جتنا اپنے چاولوں کو چھوڑنے کا رنج تھا۔ کیوں کہ اسے اچھے اچھے چاولوں کو اپنے کھیت میں بونے کا بہت شوق تھا۔ کتنے اصرار سے وہ اپنے خاوند سے کہہ سن کر دور دور سے اچھے اچھے چاولوں کے بیج منگاتی تھی اور پھر پنیری کے سبزے سے دھان کے سنہرے خوشوں تک وہ ان چاولوں کی ہر منزل پر نگہبانی کرتی۔ اس انہماک، اس شدت اس جذبے کے ساتھ کہ اکثر خود اس کا خاوند اس سے جھلا کے کہتا۔ "سردارنی! چاول کھانے کے لئے یا بازار میں بیچنے کے لئے ہوتے ہیں۔ محبت کرنے کے لئے نہیں ہوتے مگر سردارنی ایسا نہیں سمجھتی تھی۔ اسے واقعی چاولوں سے عشق تھا۔ اس لئے اس موقع پر وہ اپنی بہو کا ریشم میں لپٹا ہوا طعنہ برداشت نہ کر سکی۔ اس کی بوڑھی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ بھرائے ہوئے لہجے میں اپنے بیٹے ترلوچن سے مخاطب ہو کے بولی بہو مجھے باسمتی کا طعنہ دیتی ہے۔ تو ہی بتا تو بمبئی میں اتنے سال رہا۔ تو نے کبھی ہماری لستی کی باسمتی سے اچھے چاول کھائے ہیں۔

نہیں ماں ۔ ترلوچن نے آہستہ سے کہا ۔

اور بگیاں چاول بھی تجھے یاد ہوں گے جب بگیاں کا دھان کھیتوں میں تیار ہو جاتا تھا۔ تو کیسے سارا گاؤں اس کی خوشبو سے مہک اٹھتا تھا۔ بگیاں ایسے چاول سپنے میں بھی نہیں ملیں گے ۔

ترلوچن نے پھر سر ہلا کے کہا۔ ہاں ماں ۔ چاول تو اب سچ مچ سپنوں کی طرح ہو گئے ہیں۔

بگیاں چاولوں کے ساتھ خود ترلوچن کا بھی ایک شیریں سپنا بندھا ہوا تھا۔ ترلوچن نے آہستہ آہستہ یادوں کی پرانی رسی کو اتارتے ہوئے اس سپنے کو کھولا تو اس میں سے راج کنور نکل آئی ۔ لانبی، بانکی، حسین اور پلٹ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی گویا کہہ رہی ہو اچھا؟ تو میں سمجھی تھی کہ تم نے مجھے بھلا دیا ۔

راج کنور ایک ہاتھ میں درانتی دوسرے ہاتھ میں بگیاں چاولوں کے سنہرے خوشے لئے کھڑی تھی ۔ وہ اس کے کھیتوں میں چاول چرانے آئی تھی کہ ترلوچن نے اسے دیکھ لیا۔

ترلوچن نے پوچھا - یہ تم کیا کر رہی ہو - رات کے وقت ہمارے کھیتوں میں ۔

راج کنور چپ رہی ۔

ترلوچن نے کہا - یہ چوری ہے ۔

راج کنور نے کہا - یہ چوری نہیں مجبوری ہے ۔

ترلوچن نے کہا - کیوں ؟ کیا تمہارا باپ لال سنگھ فصل میں سے اپنا حصہ نہیں لے جاتا - ؟

راج کنور نے غصے سے کہا - کتنا حصہ ملتا ہے ؟ پہلے اس کی بات کرو - پھر یہ بتاؤ

کہ بیگماں چاولوں میں سے ہمیں حصّہ کیوں نہیں ملتا۔ ہمیں تو وہی موٹے بھورے چاول ملتے ہیں۔ بیگماں چاول تو مالکوں کے لئے ہیں۔ مزارعوں کے لئے نہیں۔ ترلوچن چپ ہو گیا۔

اور راج کنور نے سوچا وہ یہاں کیوں آئی؟ وہ یہاں نہ آتی تو اچھا ہوتا۔ مگر وہ کرتی بھی کیا کیونکہ دن کو تو ایسا بُرا محسوس نہیں ہوتا لیکن رات جب ہوا کھیتوں سے بیگماں کی خوشبو اُڑا کر اس کے بستر پر لاتی تھی تو وہ بے چین ہو جاتی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دھان کی ہزاروں بالیاں سرسراتی ہوئی اس کے کانوں میں کچھ کہہ رہی ہیں۔ جیسے دھان کے لاکھوں دانے اپنی آنکھیں کھول کر اس کی طرف تکتے ہیں اور اسے اپنے پاس بلاتے ہیں۔ ہر روز رات کو بیگماں چاول اسے اپنے پاس بلاتے تھے اور ہر روز وہ اپنے آپ کو روک لیتی تھی۔ مگر آج وہ نہ روک سکی۔ اور اپنی درانتی ہاتھ میں لئے زمیندار کے کھیتوں میں چلی آخر یہ چاول میرے کیوں نہیں ہیں؟ وہ کھڑے ہو کے سوچنے لگی۔ میں نے انہیں بویا ہے۔ انہیں پانی دھوپ چمک گرمی دی ہے۔ میں ان کے لئے پہروں گھنٹوں پانی میں کھڑی رہی ہوں۔ گھنٹوں دھوپ میں جلا کی ہوں۔ میں نے انہیں بچوں کی طرح پالا ہے آخر یہ چاول میرے کیوں نہیں ہیں؟

راج کنور نے دھان کی بالیوں کو اپنے رخسار سے لگالیا۔ اور ترلوچن سے کہنے لگی۔ ہائے کتنے اچھے ہیں یہ چاول۔ ایک ایک دانہ عطر میں بسا ہوا ہے۔ اب تم مجھے چاہو تو سردار جی کے پاس لے چلو یا پولیس میں دے دو۔ مگر میں تو آج فیصلہ کر کے آئی تھی کہ تمہارے کھیتوں سے بیگماں کے چاول لے کے جاؤں گی۔

ترلوچن نے راج کنور کے ہاتھ سے درانتی چھین لی اور کھیت میں بیٹھ کر بیگماں کے اتنے پودے کاٹ ڈالے کہ راج کنور کی دونوں بانہیں دھان کے خوشوں سے بھر گئیں۔ راج کنور کے رخسار خوشی سے تمتما اُٹھے اس نے دھان کے خوشوں کے درمیان سے ترلوچن کو

کو دیکھا اور بولی۔ تم تو کالج میں پڑھتے ہو۔؟ درانتی چلانا وہاں سکھاتے ہیں کیا؟

ترلوچن نے کہا کسان کا بیٹا ہوں۔

راج کنور نے پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں دھان کے خوشوں کو دیکھا جنہیں وہ اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ اس نے عجیب نگاہوں سے ترلوچن کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہے سُنے بغیر وہاں سے بھاگ گئی۔

راج کنور کے جانے کے بعد ترلوچن کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے یہ رات ہے اور رات کا سناٹا ہے۔ آسمان پر چاند ہے اور چاند کے گرد ہالہ ہے۔ سامنے خوبانی کا درخت ہے اور خوبانی کے درخت پر بلبل بول رہی ہے۔ چاروں طرف خوشبوؤں سے دھان کے کھیت ہیں اور کھیتوں کے کنارے کنارے لبتی ندی ہولے ہولے بہہ رہی ہے۔

مگر یہ سب کچھ اس نے راج کنور کے جانے کے بعد محسوس کیا۔

اب اس وقت اتنا کچھ یاد کرنے کے بعد ترلوچن نے سر ہلا کے کہا۔ ہاں تم ماں سچ کہتی ہو بیگماں چاول بہت ہی شیریں اور لذیذ ہوتے ہیں۔

اور مجھے یاد ہے۔ ماں نے مضطرب لہجے میں کہا۔ سردار جی ایک دفعہ سری نگر سے زعفرانی چاولوں کا بیج لے کر آئے تھے۔ یاد ہے کتنی محنت سے ہمارے مزارعوں نے وہ زعفرانی دھان ہمارے کھیتوں میں تیار کیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ زعفرانی چاول کوہ مری میں پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اگر پیدا ہو گا بھی تو اس کی خوشبو مر جائے گی لیکن جب دھان، کھیتوں میں لہلہانے لگا تو دوسرے گاؤں تک زعفران کی خوشبو گئی تھی۔ ہمارے گاؤں والے خوشی سے پاگل ہو گئے۔ یاد ہے جب وہ دھان پن چکی سے صاف ہو کے آیا تھا

تو ہائے کیسے بانکے تیکھے نکیلے پتلے پتلے چاول اس میں سے نکلتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے مہین باریک چاول لیکن جب ہانڈی میں ڈالو تو کیسے پھیل کے لمبے ہو جاتے تھے۔ ڈیڑھ ڈیڑھ پور کے لمبے چاول! یاد ہے ترلوچن ؟

ترلوچن کو اچھی طرح یاد تھا جس دن زعفرانی چاولوں کی فصل کٹی تھی۔ اسی دن اس کے باپ سردار جسونت سنگھ نے اسے گھر سے باہر نکال دیا تھا کیونکہ ترلوچن نے مزارعوں کو زعفرانی چاولوں کی فصل میں سے حصّہ مانگنے پر اُکسایا تھا۔ گاؤں کے صرف دو زمیندار تھے۔ سردار کلونت سنگھ اور سردار جسونت سنگھ۔ موضع بستی کی ساری زمین ان دو سرداروں کے پاس تھی۔ ترلوچن کا گناہ صرف اتنا ہوتا کہ وہ صرف کلونت سنگھ کے مزارعوں کو حصّہ مانگنے پر اکساتا تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ جسونت سنگھ اسے معاف کر دیتا مگر یہاں تو اس لونڈے نے خود اپنے باپ کے گھر میں بیٹھ کر اس کی زمینداری کو اُلٹنے کی کوشش کی تھی مگر وہ خود کسان لوگ زمیندار کے ڈر کے مارے نہیں مانے جو تھوڑے سے تیار بھی ہوئے انہیں جھٹ زمیندار نے بیدخل کر دیا۔ اس سے وہ لوگ اور بھی ترلوچن کے خلاف ہو گئے پھر جب ان زعفرانی چاولوں کی فصل کاٹنے کا زمانہ آیا تو ترلوچن نے ملک بیندا خاں اور ملک لال خاں اور دوسرے مزارعوں کو اس بات کے لئے تیار کر لیا کہ وہ زعفرانی چاولوں میں سے اپنا حصّہ مانگیں۔

سردار جسونت سنگھ نے گرج کے کہا۔ نہیں ملکا! نہیں لال خاں! یہ نہیں ہو گا۔ تم لوگوں کو وہی چاول ملیں گے۔ جو تم ہمیشہ لیتے آئے

ملک لال خاں بولا۔ وہی لال، موٹے اجڑ چاول۔

ہاں ہاں! وہی موٹے اجڑ چاول جو تم ہمیشہ سے کھاتے آئے ہو۔

کھیتوں میں جہاں یہ بات ہو رہی تھی۔ زعفرانی دھان کی سنہری بالیاں جگہ جگہ پڑی تھیں ملک پینڈا خاں ان کی طرف حسرت سے دیکھ کے کہنے لگا۔

سردار جی ہم نے ان پر بڑی محنت کی ہے۔ اپنے بچوں سے زیادہ محبت سے ان چاولوں کو پالا ہے۔ آخر ان پر بھی تو ہمارا حق ہے۔ کچھ تو انصاف کرو۔

اس پر ترلوچن سے نہ رہا گیا۔ اس نے باپ سے اجازت لئے بغیر وہیں سب کے سامنے مزارعوں میں زعفرانی دھان کے پولے تقسیم کرنے شروع کر دیئے اس پر اس کے باپ کو سخت غصہ آ گیا۔ وہ گھر سے بندوق اٹھا لایا اور قریب تھا کہ اپنے بیٹے کو گولی کا نشانہ بنا دے کہ ترلوچن کی ماں دوڑی دوڑی آئی اور دوسرے مزارعے بھی آ گئے بڑی مشکل سے ترلوچن کی گلوخلاصی ہوئی مگر اسے گھر سے نکال دیا گیا۔ اور مزارعوں کو چاول کا ایک دانہ بھی نہ ملا۔

ترلوچن نے وہ رات ملک پینڈا خاں کے گھر بسر کی۔ صبح اٹھ کر وہ راجکنور کے گھر کی طرف چلا اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا کہ گاؤں چھوڑنے سے پہلے وہ راج کنور کو ایک نظر دیکھ لے۔ مگر راجکنور اپنے گھر موجود نہ تھی۔ پتہ چلا کہ وہ گردوارے گئی ہوئی ہے۔ ترلوچن گردوارے پہنچا لیکن دہلیز پر رک گیا۔ اور دہلیز کے باہر جوتوں میں راج کنور کا جوتا تلاش کرنے لگا۔

گردوارے کی دہلیز کے باہر بہت سے جوتے پڑے ہوتے تھے۔ اچھے جوتے بُرے جوتے، نئے جوتے، پرانے جوتے۔ چھوٹے جوتے بڑے جوتے۔ ترلوچن ان میں سے بہت سے جوتوں کو پہچانتا تھا کیونکہ انسان کے ہاتھ اور پاؤں جس چیز کو چھوتے ہیں اس میں اپنے کردار کا خاکہ، اپنے سماج کی تصویر، اپنے ماحول کی تفریق، اس کا تضاد اور کشمکش بھر دیتے

ہیں۔ جوتوں سے آدمی کسی کے بچپن کو مسکراتا دیکھ سکتا ہے۔ کسی کی جوانی کا گیت سُن سکتا ہے۔ کسی کے بڑھاپے کی جھریاں گن سکتا ہے۔ جوتے نہ صرف انسان کی عمر بتاتے ہیں اور جنس بتاتے ہیں بلکہ اس کے طبقے کا نام بھی بتاتے ہیں۔ اور پبلک سیفٹی آرڈیننس کے باوجود بتاتے ہیں کیونکہ بعض انسانوں کو تو جیل اور پھانسی کا ڈر دلا کر جماعتی تفریق اور طبقاتی جنگ کی سچائی کے اظہار سے روکا جا سکتا ہے لیکن جوتوں کو کوئی نہیں روک سکتا اور ننگے پاؤں کو کوئی نہیں روک سکتا اور چاولوں کو کوئی نہیں روک سکتا۔

یہ جوتے بتاتے ہیں کہ ان کے پہننے والے رحمدل کسان ہیں۔ یہ جوتے بتاتے کہ ان کے پہننے والے ان سے اونچے کسان ہیں۔ یہ پمپ شو سردار جسونت سنگھ کا ہے۔ یہ کینپ کا جوتا سردار کلونت سنگھ کا ہے۔ یہ سیاہ بوٹ تھانیدار حکم سنگھ کا ہے۔ یہ پشاوری چپل خوشحال چند پٹواری کی ہے۔ یہ جوتے باقی جوتوں میں سے الگ الگ اور خوش حال نظر آتے ہیں۔ جوتے نہ صرف سماج کا تضاد بتاتے ہیں بلکہ حکومت کا استبداد بتاتے ہیں اور زمیندار کی دولت بتاتے ہیں۔ جوتے کبھی کبھی اخبار کا کام بھی کرتے ہیں۔ مثلاً یہ گرگابی جیت کور کی ہے جس کا خاوند پچھلے ماہ فوج سے آیا ہے اور اس کے لئے یہ گرگابی لایا ہے۔ یہ نیا جوتا ہر نام سنگھ کا ہے جس نے بنیئے سے قرض لے کر اپنی بیٹی کی شادی کی ہے اور اس خوشی میں یہ نیا جوتا بنایا ہے۔ یہ ایک بیساکھی اور ایک فوجی جوتا رام سنگھ کا ہے جو جنگ میں دو ٹانگیں لے کر گیا تھا اور ایک ٹانگ لے کر واپس آیا ہے۔ یہ نیا جوتا کس کا ہے؟ ہمارے گاؤں میں تو اس طرح کے جوتے نہیں پہنے جاتے۔ ضرور کوئی اجنبی ہمارے گاؤں میں آیا ہے۔ ترلوچن نے سوچا۔ پھر اس کی نگاہ راج کنور کے سلیپر پر پڑی اور اس کی نگاہوں میں خوشی کی چمک اٹھی تو راج بھی واقعی گوردوارے کے اندر ہے۔

ترلوچن گوردوارے کے باہر کھڑا کھڑا چند لمحوں تک سوچتا رہا وہ گوردوارے کے اندر جائے کہ نہ جائے۔ اندر اس کا باپ تھا اور راج کنور بھی تھی۔ کبھی وہ اپنے باپ کے جوتوں کی طرف دیکھتا کبھی راج کنور کے سلیپر کی طرف۔ گاؤں میں خبر پھیل چکی تھی کہ زمیندار نے اپنے بیٹے کو گھر سے نکال دیا ہے جب وہ گوردوارے کے اندر آجائے گا تو لوگ اس کی طرف کس طرح دیکھیں گے اس خیال سے بھی وہ رک گیا۔ یکایک اسے ایسا معلوم ہوا جیسے دہلیز کے باہر سارے جوتے منہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ یہ زمیندار کا بیٹا ہے جسے اس کے باپ نے اسے گھر سے نکال رہے ہیں۔ وہ ان کی طنزیہ نگاہوں کی تاب نہ لاسکا اور فوراً گوردوارے سے مڑ کر واپس چلا گیا۔ جاتے وقت اس نے بڑی حسرت سے ایک آخری نگاہ راج کنور کے سلیپر پر ڈالی اور پھر وہاں سے چپ چاپ چلا گیا۔

ترلوچن خاموش ہوکر اپنے گاؤں سے رخصت ہوگیا اور پھر کبھی واپس نہیں گیا۔ گارڈن کالج راولپنڈی میں اب اس کا پڑھنا ناممکن ہوگیا تھا۔ اس لئے وہ لاہور چلا آیا۔ اسے مصوری کا شوق تھا۔ یہاں پر وہ سردار گوپال سنگھ کمرشل آرٹسٹ کے سٹوڈیو میں ملازم ہوگیا۔ اور کام سیکھتا رہا۔ پھر لاہور سے وہ بمبئی چلا آیا کیوں کہ بمبئی میں ایک اچھے آرٹسٹ کے لئے میدان زیادہ وسیع تھا۔ یہاں آکے تھوڑے ہی دنوں میں اس کا کام اتنا پسند کیا گیا کہ وہ اپنا سٹوڈیو کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ اب آٹھ سال سے وہ بمبئی میں مقیم تھا۔ یہاں اس نے ایک مراٹھی لڑکی سے شادی کرلی۔ مالا جو اس کی بہو تھی۔ اب اس کے چار بچے بھی تھے اب وہ قریب قریب اپنے گاؤں کو بھول سا گیا تھا۔ لیکن کبھی کبھی کسی گاؤں کی تصویر میں رنگ بھرتے ہوئے اس کے ذہن میں راج کنور کے سلیپر اُبھر آتے اور وہ سوچتا۔

جانے وہ چھوٹے چھوٹے سلیپر آج کہاں ہیں ؟ جانے کس دہلیز کے کنارے کس کا انتظار کر رہے ہیں۔ آج وہ خود دوسرا تھا۔ اس کی دہلیز دوسری تھی۔ وہاں پر کوئی اور ہی سلیپر پڑے پڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی اس سے کیا ہوتا ہے زخم بھر جاتا ہے لیکن زخم کی یاد تو نہیں بھرتی۔

اس لئے جب ماں نے اپنے بیٹے سے زعفرانی چاولوں کے بارے پوچھا تھا تو بیٹا سر ہلائے چپ ہو گیا۔ اس نے دو ایک لمحوں کے لئے حیرت سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ کتنے تعجب کی بات ہے۔ ماں کو زعفرانی چاول یاد ہیں لیکن میرا گھر سے نکالا جانا نہیں مگر وہ اپنی ماں کی کمزوری اچھی طرح جانتا تھا۔ اس لئے اس وقت چپ ہو رہا۔ ماں نے ہولے ہولے سر ہلایا۔ اور اپنی بہو کی طرف دیکھ کر کہنے لگی۔ مالا تو مراٹھی لڑکی ہے تو ہمارے گاؤں کے چاولوں کی خوشبو کیا جانے ؛ تو نے کبھی ہماری بستی کی باسمتی کھائی ہوتی تو میں تجھ سے بات کرتی۔

مالا نے جل کے کہا۔ ہاں ماں جی ! ہم نے تمہارا گاؤں دیکھا نہ تمہارے گھر کے چاول کھائے۔ اب ہم کیا جانیں کوئی سچ کہتا ہے یا جھوٹ۔

ماں نے کہا۔ اچھا تو میں جھوٹی ہوں اور تو سچی ہے ؟ ہاں ہاں ٹھیک ہے، میں جھوٹی ہوں اور تو سچی ہے۔ کیونکہ تو گھر والی ہے اور میرا اب کوئی نہیں ہے۔ ماں نے آبدیدہ ہو کے کہنا شروع کیا۔ اب میرے کھیت میرے نہیں ہیں۔ بجلی پڑے ان پاکستانی چاول چوروں پر جنہوں نے میرے چاول مجھ سے چھین لئے ورنہ مجھے کیا ضرورت تھی کہ میں اس "اگڑے تگڑے" کرنے والی لڑکی کے گھر آتی۔

مالا نے انگلیاں نچا کے کہا واہ میرے "اگڑے تگڑے" پر حرف رکھتی ہو اور اپنے "ایتھے ویتھے" کو بھول جاتی ہو۔ یہ "ایتھے ویتھے" کیا ہے۔ پنجابی زبان کو بالکل جنگلیوں کی

زبان ہے۔

ماں نے چلا کے کہا۔ اور تیری مراٹھی زبان کیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے منہ میں پتھر ڈال کے بول رہے ہیں۔

"پتھر پڑیں تیرے منہ میں۔"

"تیرے منہ میں۔"

مالا اور سردارنی دونوں اُٹھ کھڑی ہوئیں اور عنقریب تھا کہ گتھم گتھا ہوجائیں لیکن ترلوچن بیچ میں آگیا۔ وہ ماں اور بہو دونوں کو ڈانٹنے لگا۔ اپنی ماں اور دادی کو لڑتے دیکھ کر اپنے باپ کو اونچا بولتے دیکھ کر بچے بھی رونے لگے اور سب سے چھوٹی بچی راجکنور تو بالکل ہی ڈر گئی (ترلوچن نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کا نام راج کنور رکھا تھا۔ محبت کیسے ایک سطح سے دوسری سطح پر آجاتی ہے۔ محبوب کی چاہت کیسے بیٹی کی چاہت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ یہ بڑا دلچسپ مشاہدہ ہے) ترلوچن نے راج کنور کو اپنی گود میں اٹھا کر پچکارا۔ دلاسا دیا۔ بڑے بچے کو دادی نے سنبھالا اور دونوں منجھلے ماں کی ساڑھی پکڑ کر رونے لگے۔ مالا انہیں پیار کرنے لگی اور ساس بہو دونوں اپنی لڑائی بھول گئیں۔

ترلوچن نے کہا۔ آج نمائش میں جانا تھا۔ آج سٹوڈیو بند کیا۔ دوسرے سارے پروگرام ختم گئے۔ بچوں کو تیار کیا۔ اب تم دونوں یہ فساد کر کے بیٹھ گئی ہو۔ مالا کیا تم سے بھی چپ نہیں بیٹھا جاتا۔ ماں جی تو مزاج کی تیز ہیں۔ کیا تم ان کی خاطر اپنی زبان تھوڑی دیر کے لئے دانتوں تلے نہیں داب سکتیں۔

اچھا تو مالا نے سچ مچ اپنی چھوٹی سی سرخ زبان دانتوں تلے دبا کے دکھایا۔ اس کی یہ ادا ترلوچن کو بہت پسند آئی۔ ترلوچن مسکرا دیا۔ ماں بھی مسکرا پڑیں۔

مالا گو مراٹھی لڑکی تھی اور اس لئے غیر قوم کی تھی مگر بڑی حسین تھی۔ آج جب اس نے زبان دانتوں تلے داب کے دکھائی تو سردانی کو وہ ایک بچی کی طرح معصوم خوبصورت اور پیاری معلوم ہوئی۔ ماں اس کی اس پیاری ادا کو دیکھ کر بالکل بے اختیار ہو کر ہنس پڑیں۔ ساس کو ہنستے دیکھ کر مالا کا انداز بھی بدل گیا۔ اس نے جھٹ آ کے ماں کے پاؤں چھوئے اور ماں نے اسے فوراً گلے سے لگا لیا اور بھرآئے ہوئے لہجے میں بولیں۔

"واہگورو تیرا سہاگ سدا قائم رکھے۔ تو تو میری ایک ہی بہو ہے۔ مجھ سے لڑا مت کر۔"

"میں کہاں لڑتی ہوں۔" مالا نے اپنے آپ کو ماں کی آغوش میں چھپا کے کہا۔

ترلوچن نے کہا۔ اچھا تو ماں جی۔ اب جلدی سے کھانا کھا لو۔ نمائش میں دیر ہو رہی ہے۔

ماں نے کہا۔ نہیں ترلوچن میں نمائش دیکھنے نہیں جاؤں گی۔

ترلوچن نے کہا۔ نہیں ماں جی! بڑی اچھی نمائش ہے۔ روس، چین، چیکوسلواکیہ، پولینڈ ہنگری اور دوسرے ملکوں میں جہاں لوگوں نے نئی زندگی شروع کی ہے۔ ان سب کا حال اس نمائش سے معلوم ہو جاتا ہے۔

ماں نے پوچھا۔ نئی زندگی سے تمہارا کیا مطلب ہے۔؟

ترلوچن نے کہا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جن جگہوں پر لوگوں نے آزادی حاصل کرنے کے بعد کسی طرح اپنی زندگی اچھی بنالی ہے۔ نمائش میں اس کا پتہ چلتا ہے۔ مثال کے طور پر چین کو لے لو۔ روس تو خیر بہت ترقی یافتہ ملک ہے مگر چین ہی کو دیکھ لو۔ مشکل سے دو برس گذرے ہیں آزادی حاصل کئے ہوئے مگر ان کی نمائش دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ یہ چینی لوگ دو سال میں کہاں سے کہاں آگے نکل آئے ہیں۔

ماں نے انکار میں سر ہلا کے کہا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ چار سالوں کی آزادی میں کچھ نہیں کر سکے۔ اب تک وہی بھورے اجڑے چاول کھا رہے ہیں۔ چینی لوگ کیسے اتنی جلدی آگے بڑھ سکتے ہیں کیا ان کے چار ہاتھ یا چار پاؤں ہیں؟ کیا بات کرتے ہو تم بھی۔

نہیں ماں۔ ترلوچن نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ چین کے لوگوں کے کام کرنے کا طریقہ ہم سب سے الگ ہے۔ وہاں پر سچ مچ لوگوں نے راج کا کام اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے انہوں نے زمینداری کو ختم کر کے ساری زمین کسانوں میں بانٹ دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب وہاں سارے کسان سفید چاول کھاتے ہیں۔

تو پھر سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ چین والے بھی پاکستان والوں کی طرح چاول چور ہیں۔ ہمارے چاول چھین کر خود کھاتے ہیں۔ بھلا میں ایسے چاول چوروں کی نمائش میں کیوں جانے لگی۔

ترلوچن نے کہا ماں۔! چین اور پاکستان کی بات ایک نہیں ہے۔ پاکستان میں تیری زمینداری ملک لال خاں اور پیدا خاں میں نہیں بٹی اسے تو جالندھر کے پٹھان زمیندار شہباز خاں کے نام الاٹ کر دیا گیا ہے۔ صرف زمیندار کا نام بدلا ہے۔ زمینداری نہیں بدلی ہے۔ بے شک گوردوارے کا پاٹھ ختم ہوا لیکن مسجد کی جوتیوں کا تضاد بدستور قائم ہے اور زعفرانی چاول والے اسی طرح بھورے چاول والوں پر حکومت کرتے ہیں کیوں کہ جو یہاں نواب تھے وہ وہاں راجہ تھے وہ یہاں آکے بھی راجہ رہے لیکن وہاں لوگوں نے ہماری طرح دھوکہ نہیں کھایا انہوں نے تو نوابی اور زمینداری کو ایک سرے سے ہی ختم کر دیا۔

ماں نے مسکرا کے کہا۔ ترلوچن تو شروع ہی سے چاول چوروں کا دوست رہا ہے

اس لئے تو ان کی حمایت کرتا ہے۔ اسی لئے باپ نے تجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ تیری سب باتیں وہی ہیں۔

ترلوچن نے کہا۔ ماں اب تو چلے گی یا بے کار بحث کرتی جائے گی۔

چلوں گی کیوں نہیں۔ اب گھر سے سب لوگ جا رہے ہیں تو اکیلی بیٹھ کے یہاں کیا کروں گی۔

مالا نے کہا۔ ہماری ہمسائی لیشپانگ تنما بھی چل رہی ہے۔ اسے بھی ساتھ لے لیں۔

نمائش میں پہنچ کر لیشپانگ رتنا اور اس کا خاوند روسی نمائش گھر دیکھنے چلے گئے۔ روسی نمائش گھر سب سے اونچا، پُرشکوہ اور عمدہ تھا اور مالا کی خواہش بھی یہی تھی کہ سب سے پہلے روسی گھر کو دیکھا جائے مگر ماں سب سے پہلے چینی نمائش گھر دیکھنے پر مصر تھیں۔ کہنے لگیں میں تو دیکھوں ان چینی لوگوں نے کیسے دو سال ہی میں اتنی ترقی کر لی ہے مجھے بالکل یقین نہیں آتا۔ اس لئے سب سے پہلے میں تو چینی گھر دیکھوں گی۔

ترلوچن اپنی ماں، بیوی اور بچوں کو لے کر چینی گھر میں داخل ہوا۔ آہستہ آہستہ ہر سیکشن سے گذرتے ہوئے ماں کو ہر بات سمجھائے جاتا تھا۔

دیکھو ماں، یہ چین کا کوئلہ ہے، یہ کچا لوہا ہے۔ یہ دونوں مانچوریا کی کانوں سے نکالے جاتے ہیں۔ مانچوریا چین میں ہے۔ چین میں لوہے اور کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔

ماں نے کہا۔ مگر ہمارے ہندوستان میں بھی لوہے کوئلے کی بڑی بڑی کانیں ہیں۔

ترلوچن نے کہا۔ یہ دیکھو یہ چین کے برتن کتنے خوبصورت ہیں۔

ماں نے کہا۔ مگر ہمارے مرادآباد کے برتن ان سے کم خوب صورت نہیں ہوتے

ترلوچن نے کہا۔ یہ چینی کپڑے، ریشم کے کپڑے، سوت کے کپڑے، یہ دیکھو

چینی بروکیڈ۔

ماں نے کہا۔ مگر ہمارے ہاں بھی ریشمی سوتی ہر طرح کا کپڑا تیار ہوتا ہے۔ بروکیڈ ہمارے ہاں ہوتی ہے اور بنارس کی ساڑھی کا جواب دنیا میں کہیں ہے ؟

ترلوچن نے کہا۔ یہ دیکھو دھان اور گیہوں کے خوشوں کا بنا ہوا سامان، خوب صورت پتلی چٹائیاں، ٹوپیاں، بکس جوتے۔

ماں نے کہا۔ مگر یہ کیا نئی بات ہوئی۔ ہماری بستی گاؤں کی کسان عورتیں بالکل ایسا سامان بناتی ہیں۔

یہ کاغذ کا سامان دیکھو۔ یہ ٹیبل لیمپ۔

مگر کشمیر کی پیپر ماشی اس سے عمدہ ہوتی ہے۔ یقین نہ ہو سری نگر میں جاکے دیکھ لو۔ ایک دفعہ میں سردار جی کے ساتھ سری نگر میں جاکے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں۔

یہ چمڑے کا سامان

مگر

فونٹین پن

مگر

مشینری

مگر

گلوانومیٹر

مگر

ترلوچن ہر چیز اٹھاتا گیا اور ماں بڑے مزے سے مگر کہہ کر رد کرتی گئی۔ وہ

تمام ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے بیچ بیچ میں اپنے ہونٹ خمیدہ کر کے کہتی گئیں "مگر ہمارے ملک میں تو یہ چیز اس سے بھی عمدہ تیار ہوتی ہے۔"

ترلوچن کا غصہ اندر ہی اندر بڑھتا جا رہا تھا۔ عجیب عورت ہے اسے کوئی بھی چیز پسند نہیں مگر وہ ماں سے نمائش گھر میں کیسے لڑ سکتا تھا۔ اس لئے زہر کا گھونٹ پی کے چپ ہو رہا اور اب اس نے بددل ہو کر ماں کو چیزیں دکھانا ہی چھوڑ دیا۔ اور چپ چاپ اپنے خاندان کے ساتھ چلنے لگا حتی کہ یہ لوگ چینی گھر کے آخری حصے میں آن پہنچے۔ ترلوچن بڑی بے دلی سے اپنی ماں کے ساتھ چل رہا تھا کہ یکایک اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کے ہونٹوں سے خوشی کی ایک چیخ نکلی اور وہ دونوں ہاتھ پھیلائے آگے آگے دوڑی گئی۔

مالا نے گھبرا کے اپنی ساس کی طرف دیکھا کہ ماجرا کیا ہے پھر دوسرے ہی لمحے مالا اس کے منہ سے بھی خوشی کی چیخ نکل گئی اور وہ بھی اپنے خاوند اور بچے کو چھوڑ کر اپنی ساس کے پیچھے پیچھے بھاگی گئی۔

سامنے ہزاروں من مکئی، ہزاروں من گیہوں اور ہزاروں من چاولوں کے بڑے بڑے انبار لگے تھے۔ اتنے بڑے انبار مالا نے تو خیر کبھی نہیں دیکھے تھے کیونکہ وہ بمبئی کی چاولوں میں پلی تھی لیکن ماں نے بھی جس کی اپنی زمینداری رہ چکی تھی۔ اس نے بھی اپنی زندگی میں اتنا اناج ایک جگہ رکھا نہیں دیکھا تھا۔ ماں نے خوشی سے اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک چاول کے چمکتے ہوئے انبار میں ڈال دیئے۔ ہاں وہی مہین باریک پتلے بانکے چاول تھے۔ جن کے لئے اس کی روح ترس گئی تھی۔ کیا سچ مچ یہ وہی چاول ہیں ماں کو یہ یقین نہ آتا تھا۔ وہ بار بار اپنی مٹھیوں میں ان چاولوں کو بھر کر اوپر اچھالتی جیسے کوئی ماں انتہائی

سرخوشی کے عالم میں اپنے بچے کو ہوا میں اُچھالتی ہے اور پھر نیچے آتے ہوئے اسے اپنی آغوش میں دبوچ لیتی ہے۔ ماں آج چینی چاولوں سے اس طرح پیار کر رہی تھی کیونکہ آج وہ اپنے کھیتوں میں واپس آئی تھی۔ آج اس کے سامنے دھان کے خوشے تھے آج گاؤں میں فصل کٹ رہی تھی۔ عورتیں گیت گا رہی تھیں نئی زندگی کے۔ ماں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے کیونکہ آج اسے اپنے چاول مل گئے تھے۔

ترلوچن نے دیکھا کہ صرف ایک اس کی ماں ہی ان غلّے کے انباروں کے سامنے موجود موجود نہیں ہے۔ بلکہ بمبئی کی سینکڑوں مائیں اور بہوئیں اپنے دلوں کی تشنہ کامی لئے وہاں کھڑی ہیں۔ ان کے سینے متضاد جذبات سے متلاطم تھے۔ راشن کی دُکان کے سامنے تیز چلتی ہوئی دھوپ میں لمبی قطاریں، تھکے ہوئے مضمحل اور اداس قدم دھیرے دھیرے کھوؤں کی طرف بڑھتے ہوئے بھورے بھورے پیلے پیلے راشن کارڈ جن پر ان کے نام مجرموں کی طرح لکھے ہوئے تھے۔ اور آخر میں اس لمبی قطار کے بعد ایک یونٹ چاول یا دو یونٹ گیہوں اور جب وہ اس مٹھی بھر اناج کو اپنی جھولی میں اٹھا لیتی تو سوچنے لگ جاتی یہ ہفتے بھر کا راشن ہفتے میں کتنے دن چلے گا۔ اس مٹھی بھر اناج سے وہ کس کس کی بھوک مٹائیں گی۔ اپنے بچوں کی، اپنے خاوند کی، اپنے بوڑھے باپ کی۔ راشن دینے والے کیا نہیں جانتے کہ بچوں کو تو بہت زیادہ بھوک لگتی ہے۔ وہ دن میں ایک یا دو دفعہ نہیں دس دفعہ کھانا چاہتے ہیں کیونکہ ہاتھ پھیلنا چاہتے ہیں اور ہاتھ بڑھنا چاہتے ہیں اور آنکھیں روشن ہونا چاہتی ہیں اور کلیاں کھلنا چاہتی ہیں لیکن راشن کی دکان پر صرف منیھ یونٹ ملتے ہیں۔ وہاں تھوڑی تھوڑی بھوک ملتی ہے اور آہستہ آہستہ بڑھتی ہوئی موت ملتی ہے۔ ایک یونٹ یا دو یونٹ عورتوں کا سینہ ان تلخ یادوں سے گھٹا ہوا

تھا۔ یکایک ترلوچن نے دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت نے بے اختیار ہوکر اپنے رخسار گیہوں کے انبار سے لگا دیئے۔ اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اور اس کے چہرے پر نچوں ایسی نورانی طمانیت آگئی جیسے اس نے اپنی ساری زندگی کے راشن کارڈ پھاڑ ڈالے ہوں اور ایک جست لگا کر اس زندگی میں پہنچ گئی ہو جہاں انسان کی محنت گیہوں کی طرح سنہری فراوانی پیدا کرتی ہے اور مکئی کی شہد آگیں شیرینی کو ہر ترسے ہوئے ہونٹ پر پھیلا دیتی ہے۔ ترلوچن نے بڑی مسرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا جو اپنے بچوں کو دوسرے بچوں کے ساتھ اناج کے انباروں کے گرد ناچتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس وقت سبھی عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے ایک ہی سرخوشی سے سرشار معلوم ہوتے ہیں۔ ترلوچن نے دیکھا۔ اس وقت ان کے چہروں پر وہ سارے سپنے ابھر آئے تھے جنہیں انہوں نے آج تک ناممکن سمجھ کر اپنے زندانی سینے کے کسی تاریک گوشے میں قید کر رکھا تھا۔

اس وقت ان سب لوگوں کی نگاہیں بے اختیار نئے چلن کو سلام کر رہی تھیں۔ اس نئی زندگی کو اس نئی محبت کو سلام کر رہی تھیں۔ جس نے اپنی متحدہ کاوش سے نئی زندگی کے انبار لگا کر ان کے سامنے رکھ دیئے تھے اور دور کھڑے ہوئے نمائش گھر کے چینی کارکن بھی مسرت سے مسکرا رہے تھے گویا زبان حال سے کہہ رہے تھے جو کچھ ہم نے کیا ہے وہ تم بھی کر سکتے ہو۔ تمہاری آنکھوں کے سپنے بھی سچے ہو سکتے ہیں لیکن یہ سپنے، صرف دیکھنے سے سچے نہیں ہوتے۔ پہلے ان میں ہل چلانا پڑتا ہے پھر ان میں اپنا خون بونا پڑتا ہے۔ پھر کہیں جا کر سپنوں کی پہلی فصل سچی ہوتی ہے۔

رات کے نو بجے وہ لوگ اپنے گھر پہنچے۔ رستے میں ماں بالکل خاموش رہی۔ ترلوچن نے بھی اپنی ماں سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ صرف کبھی کبھی کنکھیوں سے اپنی

ماں کو دیکھ لیتا تھا۔ ہر بار وہ اپنی ماں کو کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا پاتا۔ گھر پہنچ کر مالا نے کواڑ کھولے بتی روشن کی اور پھر بچوں کی طرح ساس سے پوچھنے لگی۔

بچے بھوکے ہیں۔ اس وقت کیا پکاؤں جو جلدی سے تیار ہو جائے۔

ماں نے کہا۔ وہی بھورے چاول پکالو، جلدی تیار ہو جائیں گے۔

مالا نے پوچھا۔ آپ بھورے چاول کھائیں گی۔ خفا تو نہ ہوں گی۔

"نہیں۔" ماں نے بڑے اعتماد سے کہا۔

مالا مسکرانے لگی۔ بولی۔ ماں جی! اگر میں آپ کو آج سفید چاول کھلاؤں تو مجھے کیا دیں گی۔

یہ کہہ کر مالا نے اپنا پرس کھولا اور اسے تپائی پر الٹا کر دیا۔ چینی چاولوں کے دانے تپائی پر بکھر گئے۔ ایک مٹھی بھر چاول۔

ترلوچن حیرت سے مالا کی طرف دیکھنے لگا۔

اتنے میں اس کا بڑا بیٹا آگے آیا۔ اس نے اپنی جیبوں کو ٹٹولا اور دو مٹھی چاول نکال کر تپائی پر رکھ دیئے پھر منجھلا بیٹا ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور اس کے بعد چھوٹا منجھلا بیٹا دونوں کی جیبوں سے وہی چاول نکلے۔ تپائی پر سفید چاولوں کی ایک چھوٹی سی ڈھیری بن گئی۔ پھر چھوٹی لڑکی راج کنور نے اپنے ننھے ہاتھوں سے اپنی ننھی فراک کے ننھے پاکٹ کو ٹٹولا اور اس میں سفید چاول نکال کر اپنی ننھی مٹھی بھری اور ماں جی کو دکھا کر بولی "میں بھی تاول لائی ہوں۔ دیکھو ماں جی میں تاول لائی ہوں۔" اب سب بچوں کی نظریں، مالا کی، ترلوچن کی نگاہیں ماں پر تھیں۔ ماں ان نگاہوں کا بوجھ نہ سہار سکی۔ ان کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا۔ پھر ان کی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ پھر انہوں نے اپنی انگلیوں کو بے چین پاکر انہوں نے

" اپنے دوپٹے کے پلو کو ٹٹولنے دیا اور خود بخود پلو کے کونے سے ایک مٹھی چاول سرک کر تپائی پر آگرے۔

ترلوچن نے مسکرا کے کہا۔ ماں تم بھی ؟ ۔ چاول چور ؟ ۔ !!!

ماں سر جھکا کر خاموش ہوگئی۔ بہت دیر تک خاموش رہی پھر اس نے آہستہ آہستہ اپنا سر اٹھا کے اپنے بیٹے سے کہا۔ "آج مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ تم لوگ چاول چور نہیں ہو تم چاول پیدا کرنے والے ہو اور تھوڑے سے چاولوں میں اور بھورے چاولوں کو سفید چاولوں میں تبدیل کرنے والے ہو اور اگر اس پر بھی دنیا تمہیں چاول چور کہتی ہے تو کہے۔ میں آج سے تمہارے ساتھ ہوں۔ واہگورو تمہیں فتح دے۔

یہ کہہ کر ماں نے ترلوچن کو گلے لگا کر اس کا ماتھا چوم لیا۔

ترلوچن کا چہرہ کھل اٹھا۔ مالا خوشی سے مسکرانے لگی۔

بچے سفید چاولوں کو تپائی پر دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اور چیخ رہے تھے۔ اور تالی بجا رہے تھے۔ یہ شور سن کر مالا کی ہمسائی پشپا ناگ رتنا بھی اندر چلی آئی۔ کیا ماجرا ہے؟ کس بات کی خوشی ہے؟

مالا نے کہا۔ آج ہمارے گھر ایک بیچینی مہمان آیا ہے۔

مالا نے یہ کہہ کر تپائی پر پڑے ہوئے چاولوں کی طرف اشارہ کیا۔

ناگ رتنا نے ان چاولوں کی طرف دیکھا۔ پھر مالا کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ "آج یہ مہمان ہمارے گھر بھی آیا ہے۔"

امن کی انگلیاں

ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آدمی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں داخل ہو رہا ہو۔ اگر حادثہ ہو جائے جب بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک عالم سے دوسرے عالم میں گزر رہے ہیں لیکن ریل گاڑی کمرے اور عالم یوں یکایک نہیں بدلتے بلکہ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس لئے مجھے ریل گاڑی میں سفر کرنا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے اور وہ بھی کالے انجن والی گاڑی جو کوئلے اور پانی سے چلتی ہے۔ بمبئی کی الیکٹرک ٹرین تو بالکل ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے سرکٹا ہوا ہے۔ مجھے ذرا اچھی نہیں لگتی۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ سر کدھر ہے اور دھڑ کدھر ہے؟ کبھی سر سے چلنے لگتی ہے کبھی دھڑ سے۔ بمبئی میں آپ نووارد ہوں اور یہ گاڑی اسٹیشن پر آپ کو کھڑی دکھائی دے تو آپ خود یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ یہ گاڑی شمال کو جائے گی یا جنوب کو۔ اکثر اسی دھوکے میں بہت سے لوگ چرچ گیٹ جاتے جاتے بوری بندر پہنچ جاتے ہیں۔ ایسی چار سو بیس گاڑی ہے۔ یہ ڈیموکریٹک سوشلزم کی طرح دائیں بائیں اس کی سمت کا کوئی پتہ نہیں چلتا لیکن آپ کالے انجن والی گاڑی کے متعلق یہ الفاظ کبھی استعمال نہیں کر سکتے جب کوئلے اور پانی سے بھرپور انجن شعلے اڑاتا ہوا بھاپ پیدا کرتا ہوا اپنی چمنی سے دھواں نکالتا ہوا پچیس ڈبوں کی ایک لمبی قطار کو کھینچتا ہوا مغرور انداز میں اسٹیشن یارڈ

کے اندر دوڑتا ہوا آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ کسی فاتح جرنیل کی سواری آرہی ہے۔ مسافر حرکت میں آجاتے ہیں۔ خوانچے والے صدائیں دینے لگتے ہیں اور جاہل سے جاہل مسافر بھی سمجھ جاتا ہے کہ گاڑی ادھر جائے گی جدھر انجن لگا ہوا ہے۔ سمت معلوم ہو تو سفر میں دھوکہ کھانے کا کم احتمال ہے۔

اسی لئے جب میں مدراس جنتا ایکسپریس میں بیٹھا تو گاڑی کے آگے کالے انجن کے دیو کو دیکھ کر ڈھارس ہوئی کہ یہ گاڑی مدراس ہی جائے گی۔ کہیں سمندر میں لے کے نہیں ڈوب جائے گی۔ اس کے علاوہ جنتا ایکسپریس میں ایک اور بھی خوبی ہے۔ یعنی اس میں سارے ڈبے تھرڈ کے ہیں۔ جنتا ایکسپریس جو ٹھہری۔ دراصل پندرہ اگست کی آزادی کے بعد ہمارے حاکموں نے بہت سے معاملے صاف کر دیئے ہیں جنہیں انگریزوں نے بری طرح الجھا رکھا تھا یعنی صاحب پہلے درجہ اوّل تھا۔ پھر درجہ دوم اور پھر درجہ انٹر۔ پھر درجہ سوئم جنتا ایکسپریس نے وہ معاملہ ختم کر دیا ہے اب دو درجے بلکہ دو ہی قسم کی گاڑیاں باقی رہ گئی ہیں۔ ایک تو جنتا گاڑی ہے جس پر جنتا سفر کرتی ہے۔ دوسری اجنتا گاڑی ہے جس میں اجنتا کی تصویروں سے مشابہت رکھنے والی خواتین اور ان کے شوہر سفر کرتے ہیں۔ جنتا اور اجنتا میں جو امتیاز آج سے ہزاروں برس پہلے تھا وہ آج بھی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر محسوس ہوتا ہے۔

میرے ساتھ کرشن تھا۔ دبلا پتلا اور بے حد بوکھلایا ہوا۔ اس کی نگاہوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ آدمی ٹکٹ گھر بھول آیا ہے۔ غلط گاڑی میں سوار ہوا ہے۔ کسی اجنبی کے ساتھ سفر کر رہا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میرا نام کرشن چندر ہے۔

ٹکٹ میرے بٹوے میں ہے۔ سامان ریک کے اوپر ہے اور گاڑی مدراس جا رہی۔ تو اس نے اطمینان کا سانس لیا اور کھڑکی سے سر نکال کر کنگھا خریدنے لگا۔

کرشن میری طرف دیکھ کے مسکرا کے کہنے لگا۔

"میں پریشان تھا کہ کیا چیز گھر بھول آیا ہوں؟ اب یاد آیا کنگھا۔ تم لائے۔؟"

میں نے کہا۔

"لایا تو نہیں، لیکن بھولا بھی نہیں۔"

"ارے یہ کیسے ممکن ہے؛ لائے بھی نہیں بھولے بھی نہیں؟"

"ہاں۔!" میں نے کہا۔ "لایا اس لئے نہیں کہ بھولا نہیں اور بھولا اس لئے نہیں کہ کنگھے کی حاجت نہیں۔ ذرا کچھ اوپر سے یعنی اس دیک پر بیٹھ کر میرے سر کی طرف دیکھو تو کیا یہ معلوم نہ ہوگا کہ جیسے یہاں کسی آدمی کا سر نہیں طبلے کا بایاں رکھا ہے۔"

کرشن پہلے تو خوب ہنسا، پھر تھوڑا سا ہنسا اور آخر میں بالکل سنجیدہ ہو کر مجھ سے کہنے لگا۔

"مذاق چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ وائیکم پہنچ کر ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

اتنا کہہ کر اس نے نوٹ بک ہاتھ میں لے لی اور اور قلم ہاتھ میں لے لیا اور میری طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے مجھ سے کہہ رہا ہو بتاؤ۔"

میں نے کہا۔

"میں تجھ کو بتاتا ہوں۔ تقدیر رقم کیا ہے۔؟"

"کیا ہے۔؟"

میں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر کہا۔

"گاڑی تو چلنے دو۔"

گاڑی چل رہی تھی۔ زمین چل رہی تھی۔ آسمان چل رہا تھا۔ ہم سفر چل رہے تھے۔ میں

خود چل رہا تھا۔ اتنے عظیم الشان ساتھیوں کے ساتھ چلنا بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہانیاں اس لئے لکھنی شروع کی تھیں کہ شاید کبھی زمین و آسمان کو اپنے تخیل کے ساتھ چلا سکوں لیکن الفاظ کے ساتھ الفاظ کو رکھ کے کبھی اضطراری حرکت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ جو زمین کے سینے میں اور آسمان کی بلندی میں محفوظ ہے۔ کیوں میرا قلم زمین کا محور نہیں بن جاتا اور ایک بھالے کی طرح اونچے آسمان کا سینہ گھائل نہیں کر سکتا۔ پھر سوچتا ہوں میں کتنا احمق ہوں۔ لفظ کے ساتھ لفظ جوڑنا تو ایسا ہے جیسے اینٹ کے ساتھ اینٹ جوڑنا۔ دیوارِ چین اکیلے کس نے بنائی ہے۔

اسی طرح یہ گاڑی بھی اکیلے کس نے بنائی ہے جانے کتنے ہزاروں ہاتھ لگے، دماغ چلنے لگے۔ گھنٹے صرف ہوئے۔ اس کے کان کھودنے والوں نے لوہا نکالا۔ کوئلہ اور سیمنٹ تیار کیا۔ جنگل سے درخت کاٹے گئے۔ زمین کے سینے سے پانی ماں کے دودھ کی طرح ابھرا پھر کہیں آگ پیدا ہوئی۔ کتنے سالوں کی محنت مشقت، پسینے اور لہو کی آمیزش سے یہ گاڑی مجھ تک پہنچی۔ میں نے اپنے چھوٹے قلم کی محنت سے یہ گاڑی ذرا آگے ڈھکیلی۔ سچ پرچ دیوارِ چین اکیلے کس نے بنائی ہے۔؟

ہاں اتنی محنت کے بعد جب ریل کی کھڑکی سے زمین اور آسمان حرکت میں آتے ہیں تو بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک ہی تصویر سامنے سے گزرتی جا رہی ہے اور کبھی ایک نہیں تین تین تصویریں ایک دوسرے کے آگے پیچھے گھومتی ہوئی ایک عجیب دلنواز ترا تر اور ہم آہنگی سے سامنے سے گذرتی ہیں۔ کبھی کبھی آنکھ کے افق پر حرکت کی تین سطحیں نمودار ہوتی ہیں۔ لَے کے تین زیر و بم، آہنگ کے تین تاثرات ایک ہی لمحے میں اُجاگر ہوتے ہیں جیسے جب گاڑی چلتی ہے تو سب سے پہلے تار کے

کھمبے حرکت میں آتے ہیں پھر اس کے ساتھ درخت اور جھاڑ وجد میں آتے ہیں۔ ان کے پیچھے اور کھیتوں کے اندر فصل اور فصل کے اندر کھڑے ہوئے کسان گھومتے ہیں۔ کبھی تار کے کھمبوں کے پیچھے کھیت غائب ہو جاتے ہیں اور ایک اونچی گھاٹی ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ اونچی گھاٹی ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے تھک جاتی ہے تو اچانک آگے ایک ندی اپنے شفاف پانی کے ساتھ ساتھ گنگناتی ہوئی اُبھر آتی ہے اور دوسرے ہی لمحے ایک اونچے ٹیلے کے پیچھے گم ہو جاتی ہے۔ جیسے کوئی نئی نویلی دلہن ایک جھلک دکھا کر گھونگٹ کاڑھ لے۔
اب سامنے ایکھ کے کھیت میں ایک کسان صرف اپنے گھٹنوں تک نظر آتا ہے جہاں ایکھ کے کھیت ختم ہوتے ہیں وہاں نظر بہت نیچے کو گر جاتی ہے۔ گاڑی اب پل پر سے گزر رہی ہے پل کا ایک حصہ نظر آتا ہے اور پل کے نیچے ندی کا پاٹ بھی جو اب سوکھ گیا ہے اور جس کی بھوری ریت میں دور تک بیل گاڑی کے نشان بنے ہوئے ہیں۔ آنکھ کے افق پر یہ نشان بہت دور تک جاتے ہیں کسی کی بیل گاڑی تھی وہ کون لایا تھا اسے یہاں۔ ؟ کدھر کو گئی وہ بیل گاڑی ؟ بیل گاڑی آنکھ کے افق سے زمین کے افق پر منتقل ہو جاتی ہے اور نئی تصویر اُبھرتی آتی ہے۔ ایک اونچے سے ٹیلے پر ایک چھوٹا سا لڑکا بیٹھا ہے اور اس کی بڑی بہن ہے۔
بڑی بہن کے ہاتھ میں درانتی ہے۔ چھوٹا لڑکا گاڑی کی طرف دیکھ کے ہنستا ہے اور زبان نکال کر منہ چڑاتا ہے۔ بڑی لڑکی شرما جاتی ہے۔ گاڑی میں اسے کسی نے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ محبت جو ایک لمحے کے لئے ٹھٹھکی اور اس ٹیلے پر چھلک کر جاوداں ہو گئی۔ کتنے لوگوں نے انسان کی اس ایک لمحے کی محبت کی کہانی لکھی ہے۔ دیوار چین اکیلے کس نے بنائی ؟

کرشن نے کہا

"سگریٹ پیو گے ؟"

میں نے کھڑکی کے اندر سر کر لیا اور کہا۔
"ڈاکٹر نے منع تو نہیں کیا، پی سکتا ہوں۔"

میں نے سگریٹ منہ میں رکھا اور ابھی ماچس جلائی نہ تھی کہ میری نظر سامنے ایک عورت پر پڑی جو تیسری بینچ پر بیٹھی اپنی ننھی کا فراک بدلنے میں مصروف تھی جب ہماری نظریں ملیں تو وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ مجھے ایک لمحے کے لئے دھوکا ہوا۔ پھر خیال آیا نہیں یہ ممکن نہیں۔ میں نے اچھی طرح آئینے میں اپنی صورت دیکھی ہے۔ اس لئے یہ ممکن نہیں لیکن وہ عورت مجھے ابھی تک دیکھ رہی تھی عجیب نگاہوں سے اور لڑکی کا فراک اس کی بانہہ میں پھنسا ہوا تھا آخر میں نے نگاہ پھیری اور لڑکی کے چلاّنے پر فراک بانہہ سے نکل کر جسم پر آگیا۔ عورت نے پھر عجیب نگاہوں سے میری طرف دیکھا اس نگاہوں میں سوال نہ تھا۔ نفرت بھی نہ تھی۔ ایک عجیب طرح کی سمجھ تھی۔ جیسے وہ مجھے اچھی طرح جانتی ہو۔ میرے اس قدر قریب ہو۔ ایک ایسی راز داری اور قریب کی سمجھ اور اس سمجھ کا احساس مجھ تک پہنچا دینے کے جذبے کی صورت ہی اس کی نگاہ میں تھی۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ سفر کی کئی منزلیں گزر گئیں۔ آفتاب غروب ہوگیا۔ کھڑکی جو آئینہ جہاں جہاں تھی ایک تاریک روزن کی طرح نظر آئی جہاں حدِ نگاہ پر آسمان کی نیلاہٹ رہ گئی تھی۔

اسی طرح کئی بار میری اور اس کی نگاہیں ملیں اور جب تاریک ڈبے کے اندر روشنیاں جلیں تو اس کی نگاہوں کی اداسی اور ایک عجیب سی محبت نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں دیکھنے لگا مجھ میں کیا ہے۔ جو اس کے خاوند میں نہیں۔ وہ تو بہت اچھا گٹھے جسم کا ڈیل ڈول والا جوان ہے۔ فرق یہی ہے اس نے دھوتی پہن رکھی ہے اور میں نے

پتلون - فرق یہی ہے کہ میں نے شیو نہیں بنایا اور اس نے شیو بنا رکھا ہے - اس کے ساتھ اس کے دو تین رشتہ دار بیٹھے ہیں جو سب آپس میں بے تکلف ہیں اور ایک دوسرے سے ہنستے ہوئے باتیں کر رہے ہیں - اسی بے تکلفی کے انداز میں وہ اس کی بیوی سے باتیں کر رہے ہیں - نیا فراک پہنے ہوئے ننھی بچی میری طرف دیکھ کے مسکراتی ہے - پھر وہ میرے قریب آجاتی ہے - میں اسے ایک سنگترہ دیتا ہوں - باپ میری طرف دیکھ کے آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتا ہے - لیکن وہ عورت اب میری طرف نہیں دیکھ رہی ہے -

لیکن میں نے دیکھ لیا ہے - اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں -

یہ آنسو کس لئے ہیں - میرے لئے تو نہیں ؟ اتنی جلدی کون اپنے دل کے موتی میرے لئے رول سکتا ہے - پھر یہ اُداسی کیوں ؟ اجنبی عورت بتادے کہ تیرے دل کا غم کیا ہے -؟ کیا تیرا خاوند تجھ سے پیار نہیں کرتا ؟ کیا تیری ساس ظالم ہے ؟ کیا تو اپنے میکے میں کسی سے محبت کرتی تھی ؟ اور آج وہ وادیاں تجھ سے دور کھو گئی ہیں - لیکن یہ آنسو کچھ نہیں بتاتے - دو ہی تو آنسو تھے جو گرے اور پھر پلّو کے ایک جھٹکے سے پونچھ ڈالے گئے - میں نے سوال کو سمجھا ہی نہیں اجنبی عورت جواب کیا دوں ؟

اب رات زیادہ جاچکی ہے کیونکہ روشنیاں کافی تیز معلوم دیتی ہیں جب اندھیرا بڑھ جاتا ہے تو معمولی روشنی بھی بھڑکتا ہوا شعلہ بن جاتی ہے یہی حالت میری تھی - اسکے احساس کی معمولی سی چنگاری بھی محبت کا شعلہ معلوم ہوتی تھی - نہیں ہوتی تھی مگر پھر بھی معلوم ہوتی تھی -

وہ کھانا پروسنے لگی - اس کے خاوند نے اور اس کے دوسرے ساتھیوں نے فرش پر بہت سے ٹرنک ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر ان پر اخبار بچھا دیئے اور وہ عورت ایک اونچے ٹفن کیریر میں سے کھانا نکال کر پروسنے لگی سب سے پہلے اس نے اپنے خاوند

کے دوستوں کو کھانا دیا۔ پھر اپنے خاوند کو۔ اپنے خاوند کو کھانا دیتے ہوئے یکایک اس کی انگلیاں اپنے خاوند کی انگلیوں سے جا لگیں اور میں نے محسوس کیا نہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس عورت کو اپنے خاوند سے محبت نہیں ہے۔ میں ان انگلیوں کے لمس کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ جب انگلیاں انگلیوں سے چھو جاتی ہیں۔ ایک لمحہ کے لئے رک جاتی ہیں۔ رک کر ایک دوسرے سے کھیلنے لگتی ہیں اور اس سے پہلے لوگوں کی توجہ اس طرف جائے جلدی سے گھبرا کر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہیں یہ وفادار اور عظیم محبت کی انگلیاں میں انہیں پہچانتا ہوں۔ ان کا عزت و احترام کرتا ہوں۔ میں بھی ان انگلیوں سے کھیلا ہوں۔ بچپن میں اور لڑکپن میں اور جوانی میں۔ یہ انگلیاں ممتا اور موہ کے بارے کانپتی ہوئی انگلیاں جو بچوں کو پالنے میں سُلاتی ہیں جو شوہروں کے سینے پر محبت کی شرمائی ہوئی آرزوؤں کی طرح دھیرے دھیرے سرکتی ہیں۔ انگلیوں جو چاول چُنتی ہیں۔ خط لکھتی ہیں اور آتشدان پر اپنے شوہر کی تصویر رکھتی ہیں۔ انگلیاں جو چولہا سُلگاتی ہیں۔ گھر بناتی ہیں۔ گھر میں رہتی ہیں اس وقت بھی جب گھر میں کوئی اور نہیں رہتا۔ اس وقت بھی جب مرد میدان جنگ کو چلے جاتے ہیں۔ اور یہ انگلیاں دعا کے لئے آسمان کی سمت اُٹھ جاتی ہیں۔

یہ انگلیاں اپنے خاوند سے رخصت ہو کر جُھک گئیں۔ جس طرح محبت کی شاخ ثمردار ہو کر جُھک جاتی ہے۔ اب کھانا ننھی سی لڑکی اور اس عورت کیلئے بچا تھا۔ کھانا کھانے سے پہلے اس نے پھر میری طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ میں ایک اضطراری جنبش ہوئی جیسے میری طرف لپکنا چاہتی تھی جیسے کچھ کہنا چاہتی تھی۔

”تم بھی کھالو یہ کھانا۔ آؤ شریک ہو جاؤ۔“

پھر ایک بے تابی اور بے چینی سے وہ جنبش وہیں ختم کر دی گئی اور اس نے سر جھکا

ے اپنی ننھی لڑکی کے ساتھ کھانا شروع کر دیا۔

کرشن نے کہا۔ کھانا کھاؤ گے ۔؟"

میں نے کہا۔ "ڈاکٹر نے منع تو نہیں کیا لیکن پھر بھی نہیں کھاؤں گا۔"

"کیوں ؟"

"بس صرف پھل کھاؤں گا۔"

میں نے تھیلے میں دو تین سیب اور چند نارنگیاں نکال لیں۔ سیب کاٹنے کے لئے چاقو ڈھونڈنے لگا۔ چاقو کرشن کے پاس نہیں تھا۔ سامنے کے بینچ پر کسی مسافر کے پاس نہیں تھا۔ ناچار تیسرے بینچ والوں سے کہنا پڑا۔ وہ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔

اس کے شوہر نے اس سے پوچھا۔ "چاقو تمہارے پاس تو ہو گا۔؟"

اس عورت نے جلدی سے اپنا کھانا چھوڑا۔ اپنا چابیوں والا گچھا نکالا۔ چابیوں کے گچھے کے ساتھ ایک چاقو بھی بندھا تھا۔ وہ بالکل میرے قریب آگئی اور اس کی انگلیوں نے گہرے لمس کیساتھ میری ہتھیلی پر وہ چابیوں کے گچھے والا چاقو رکھ دیا میں نے اس کا تیز تیز اڑتا ہوا سانس اپنے رخسار پر محسوس کیا۔ اس کی انگلیوں کے گہرے لمس کو جو مجھ سے اتنا قریب تھا جیسے وہ مجھ سے بغلگیر ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوا دوسرے لمحے میں وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کھانا کھانے لگی اور اس کے خاوند نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور میں نے چاقو کے پھل کو سیب کے سینے میں اتار دیا۔ کاش چاقو تو خواہشوں کو اتنی آسانی سے کاٹ سکتا۔ یہ دل کے اندر کون گہرے گہرے پھندے بُن رہا ہے۔؟

کھانا کھانے کے بعد وہ لوگ جلدی جلدی سامان باندھنے لگے۔ شاید ان کا اسٹیشن قریب آرہا تھا۔ عورت نے لڑکی کا فراک پھر بدل دیا اس کے بالوں میں کنگھی کی اور اس کی آنکھوں

میں کا جل لگایا ۔ خاوند نے ایک ٹرنک کے اُوپر دوسرا ٹرنک رکھ کے سارے ٹرنک سمیٹ لئے ۔ دوستوں نے بستر باندھے ۔ پھر گاڑی دھیمی ہوگئی اور وہ لوگ چلنے لگے ۔ دوست آگے چلے ۔ پھر ایک دوست نے ننھی کو اٹھالیا ۔ آخر میں وہ اور اس کا خاوند رہ گیا وہ اپنے خاوند کے پیچھے پیچھے چلنے لگی ۔ پھر اس نے اپنے خاوند سے کچھ آہستہ سے کہا اور پھر وہ کچھ کہہ کر آہستہ سے پیچھے مڑی اور رُک کے حسرت بھری نگاہ سے میری طرف دیکھ کے اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے ۔

اُسکا خاوند بھی میری طرف مُڑا ۔ حیرت ساور سکتے میں تھا لیکن اُسکے خاوند نے جلد ہی میری حیرت دُور کردی ۔ اس نے مسکرا کے کہا ۔

" صاحب آپ حیران تو ہوں گے کہ یہ ماجرا کیا ہے لیکن بات بھی اچنبھے کی ہے ۔ یہ میری بیوی ہے اور اس کا بھائی ابھی دو ماہ ہوئے فوت ہوا ہے ۔ اس سے آپ کی شکل اتنی ملتی ہے کہ میں کیا کہوں ۔ یہ جو مڑ مڑ کر آپ کو دیکھ رہی تھی اس کے جذبات کا آپ اندازہ کرسکتے ہیں ۔"

عورت کی آنکھوں سے پھر آنسو ٹپک پڑے ۔ خاوند نے اسے دھیرے سے میری جانب موڑ دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا " آپ بُرا مت مانیئے گا ۔"

وہ دونوں چلے گئے جاتے ہوئے عورت کی اُنگلیاں کانپ رہی تھی ۔ وہ اُنگلیاں جو میرے سر پر پیار اور شفقت کا بوسہ دینا چاہتی تھیں ۔ اپنی تمام عمر عزمی اور بے بسی اور انتہائی غم کے باوجود انسان کی دنیا کتنی انوکھی اور پیاری ہے یہ انسانوں کی ہری بھری دنیا کتنی چھوٹی چھوٹی محبتوں سے تعمیر ہوتی ہے ۔

بہن کی محبت ، خاوند کی محبت ، بچے کی محبت ، اجنبی کی محبت کتنی چھوٹی چھوٹی ان گنت محبتوں کو ساتھ جوڑ جوڑ کے انسانوں نے اپنی محبت کی معراج بنائی ہے ۔

دیوار چین اکیلے کس نے بنائی ہے ؟

کرشن نے کہا۔

"ساتھی تمہیں وائیکم امن کانفرنس کے لئے اپنی تقریر تیار کرنا ہے۔ اب تیار کر ڈالو۔"

میں نے ایک عجیب محویت کے عالم میں کہا۔

یہ انسانوں سے پیار کرنے والی اُنگلیاں ان انگلیوں سے کتنی مختلف ہیں۔ جو انسانوں پر ایٹم بم گراتی ہیں۔"

پانچ روپے کی آزادی

کُل پانچ روپے آدھے جس کے ڈھائی روپے ہوتے ہیں، میری جیب میں تھے جب میں گھر سے باہر نکلا۔ گھر سے نکلتے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ آج ان پانچ روپوں میں سے ایک کوڑی بھی باقی نہیں رکھوں گا۔ مدت کے بعد آج اتنا مال ہاتھ آیا ہے اس لئے جی کھول کر اسے خرچ کروں گا۔ دن بھر بمبئی کی سیر کروں گا۔ گولڈ فلیک کے سگریٹ پیوں گا۔ پانی پوری کھاؤں گا۔ رات کو کوئی سینما تماشا دیکھونگا اور بارہ بجے کے بعد گھر لوٹوں گا۔ یہ سوچکر برساتی میں نے کندھے پر رکھی اور ایک اٹھنی کو ہوا میں اچھالا پھر اسے ہاتھ میں دبوچ لیا اور پھر چلا کر کہا: "او ہو دم چکھا ڈِک ڈِک"۔ جس کا مطلب تھا کہ آج میں بہت خوش ہوں۔ خیر ..... گھر سے نکلکر میں "چار بنگلے" سڑک پر ہو لیا جو کوئی دو سو گز کے بعد اندھیری جانیوالی پکی سڑک سے جا ملتی ہے "چار بنگلے" سڑک کی حالت آج کل ہندوستان جیسی ہو رہی ہے جو کامن ویلتھ کے اندر بھی ہے باہر بھی۔ یہ سڑک آدھی اندھیری میونسپلٹی کے پاس ہے۔ اور آدھی ورسوا ایریا کمیٹی کے پاس ہے اسلئے اس کی کبھی مرمت نہیں ہوتی اور کبھی ہوتی ہے تو بالکل اسی طرح جس طرح آج کل ہندوستان کی مرمت ہو رہی ہے۔

اس سڑک کے دونوں طرف نیچی زمین ہے جسکے کیچڑ میں جھاڑیاں اگی ہوئی ہیں اور چھوٹے چھوٹے جوہڑ بن گئے ہیں۔ جن میں سمندر کا پانی بھرا رہتا ہے۔ جب سمندر پر پانی چڑھتا ہے تو کناروں پر پھیلکر نیچی زمین میں بھر جاتا ہے اور جھاڑیاں پانی میں ڈوب جاتی ہیں۔ لیکن اس سمے جب میں گھر سے نکلا سمندر کا پانی نیچے اتر گیا تھا اور ترائی کی ریت میں بے شمار چھوٹے بڑے سوراخ نظر آتے تھے۔ جن میں چھوٹے بڑے کیڑے، گھونگھے کیکڑے اور دوسرے سمندری جانور رینگتے باہر نکلتے چلتے پھرتے اور

گھستے نظر آرہے تھے۔ ایک لڑکا کیچڑ میں کھڑا کیکڑے پکڑ رہا تھا۔ میں نے سیٹی بجا کر اس سے کہا۔ "کھو ہری داس بمبئی چلتے ہو سیر کرنے ؟" اس نے کہا میرا نام ہری داس نہیں ہے بھاؤکر ہے اور میں کیکڑے پکڑ رہا ہوں دیکھتے نہیں ؟ میں سیر کرنے کیسے جا سکتا ہوں ! میں دن بھر یہاں کیکڑے پکڑونگا اور شام کو جا کر بازار بیچونگا۔ گھر کیلئے آٹا دال لاؤں گا اور پھر کھانا کھا کر سو جاؤنگا یا اپنے ٹوٹے ہوئے گارے کو ٹھیک کرونگا۔ انکی کو مضبوط بناؤنگا۔ میرے لئے سیر کہاں ؟ بس کیکڑے ہیں۔

میں نے کہا۔ ہری داس۔ ادہو ہری داس نہیں بھاؤکر، تم دن میں کتنے کیکڑے پکڑ لیتے ہو ؟

"چھ یا سات۔ بہت ہوا تو دس بارہ۔" بھاؤکر نے کہا۔ اُسنے چھوٹے گھیر دار جال کی کھپچیوں میں نام مچھلیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مضبوطی سے باندھ دیئے اور جال کو گھما کر بڑی پھرتی سے جھاڑیوں کے اُوپر پانی کے ایک جوہڑ میں پھینک دیا۔ جال پانی میں ڈوب گیا لیکن "ترپٹ" پانی کے اُوپر تیرتے رہے۔ ان ترپٹوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "اتنے بڑے کارک کے ٹکڑے تم کہاں سے لاتے ہو ؟ وہ ہنس کر بولا۔ یہ کارک کے ٹکڑے نہیں ہیں۔ کارک تو بہت مہنگا ہوتا ہے۔ اس کو ہم سنڈال لکڑی سے بناتے ہیں۔ یہ لکڑی بالکل کارک کیطرح ہوتی ہے بلکہ اس سے اچھی ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے جال کو اپنی طرف جھٹکے سے اوپر نکالا لیکن کیکڑا ابھی بڑا ہوشیار تھا فوراً کود گیا اور پانی میں جا گرا۔ "سالا نکل گیا" بھاؤکر نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا۔

میں نے بھی ہنسکر کہا۔ "دیکھو تو سہی کسقدر یعنی کتنا ہوشیار ہے کیسے جال سے اُچھل کر بھاگا ہے۔"

بھاؤکر نے کہا۔ "ارے یہ بڑا بدماش ہوتا ہے۔ آٹھ ہاتھ پاؤں ہوتے ہیں اس کے۔"

"آٹھ ہوتے ہیں"۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

تم نے کبھی کیکڑا نہیں دیکھا۔؟ بھاؤکر نے مجھ پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔

جب میں نے انکار میں سر ہلایا تو بھاؤکر نے اپنا جال زمین پر رکھ دیا اور کانٹی کو زمین میں گاڑ دیا اور

آنکھ کھول کر اور اسے اُلٹا کر کے اس میں سے ایک کیکڑا نکالا اور مسکرا کر کہنے لگا۔ یہ دیکھو یہ کیکڑا ہے۔ اس کے آٹھ ہاتھ پاؤں ہے اور جو منہ کے اندر دو ڈنک ہیں یہ سب سے زیادہ خطرناک ہیں انہیں سے کیکڑا شکار کرتا ہے۔

بھاؤ کر نے چاقو سے ڈنک پر چوٹ کی کیکڑے کے ڈنک پھیل گئے بند ہو گئے۔ پھیل گئے لیکن وہ بالکل بیکار تھے کیونکہ جڑ کے پاس وہ ایک مضبوط دھاگے سے بندھے ہوئے تھے۔

میں نے کہا۔ یہ کیکڑا کتنے میں جائے گا؟ "چار آنے میں۔" اس نے کہا۔

آج کتنے کیکڑے پکڑے ہیں؟ ابھی تو یہی ایک ہے اور ملیں گے میں نے اسے ایک دوّنی دی۔ وہ بولا میرا کیکڑا چار آنے کا ہے۔

میں نے کہا۔ کیکڑا نہیں لے جا رہا ہوں۔ تمہیں دوّنی دے رہا ہوں۔ تمہارے چائے پانی کے لئے تم نے آج مجھے بڑی اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں۔ بس ایک بات اور بتا دو۔"

بھاؤ کر نے جال اٹھا کر پانی میں پھینک دیا اور کہنے لگا "پوچھو" اُسکی پیٹھ سیدھی میری طرف تھی۔

میں نے پوچھا۔ اگر تمہارے پاس ایکدم بہت سارا روپیہ آجائے تو تم کیا کرو گے۔

بھاؤ کر گھوم کر میرے پاس آگیا اور پل کے بعد بولا۔ گندے کیچڑ میں کام کرنے سے میرے پاؤں پر جو گھاؤ ہو گئے ہیں پہلے ان کا علاج کراؤنگا اور ... اور؟ اور پھر شادی کرونگا۔

اُسنے جال پانی سے نکالا۔ اب کے اس میں کوئی کیکڑا نہیں تھا۔ بلکہ ایک چھوٹی سی چاندی سی چمکتی مچھلی تھی بھاؤ کر نے اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ تڑپ رہی تھی اور ہانپ رہی تھی۔ وہ دو چار سیکنڈ وہ مچھلی کو دھیان سے دیکھتا رہا پھر آہستے اسے پانی میں چھوڑ دیا پھر وہ اسے دیر تک پانی میں تیرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ چھوٹی سی چاندی سی مچھلی جو اس کی زندگی کا سنہرا سپنا تھی پانی میں تیرتی ہوئی کہیں گم ہو گئی۔ بھاؤ کر نے آسمان پر دوڑتے ہوئے بادلوں کو دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس بھری

اور کہا۔ "لیکن میری شادی نہیں ہو گی۔"

میں نے کہا۔ کیوں نہیں ہو گی اب تو آزادی آگئی ہے۔ وہ بولا۔ یہ آزادی تو آکاش میں اڑتے ہوئے بادلوں کی طرح ہے میں تو ایسی آزادی چاہتا ہوں جو میری مٹھی میں آجائے اس کیکڑے کی طرح۔

اس سمے میرا جی چاہا کہ میں کاؤس جی جہانگیر ہال میں بھاڈ کر کا ایک لیکچر رکھوں اور ہندوستان کے سارے بڑے بڑے نیتاؤں کو بلاؤں اور پھر ان سے پوچھوں کہ بتاؤ بھڈا اس آزادی کی اصلیت کو جانتا ہے یا نہیں۔؟

میں "چار بنگل" اور اندھیری ورسوا روڈ کے نکڑ پر بڑی دیر تک کھڑا رہا لیکن ورسوا سے بس بالکل اسی طرح بھر کر آتی تھی جس طرح بند ڈبے میں مچھلیاں بھری ہوتی ہوں۔ میں نے سوچا چلو چار بنگلے سے پہلے ورسوا چلیں پھر وہاں سے اندھیری آئیں گے۔

اور کوئی صورت نہ دیکھی تو جانے والی بس پکڑی۔ دو آنے کا ٹکٹ لیا۔ ورسوا پہنچ کر اڈے پر ایک پان کھایا پھر واپس آکر بس میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں بس چل پڑی۔ ساڑھے تین آنے ٹکٹ کے دیئے۔ کنڈیکٹر میری طرف دیکھ کے مسکرایا، میں اسکی طرف دیکھ کے مسکرایا۔ وہ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا اس کے جواب میں پھر مسکرانے والا تھا کہ اُسنے مجھے چپکے سے ساڑھے تین آنے کے بدلے ایک آنے کا ٹکٹ کاٹ دیا۔ میں نے ذرا اچنبھے سے ٹکٹ کیطرف دیکھ کر اس کیطرف گھور کے دیکھا۔ وہ جواب میں پھر مسکرایا لیکن اب کے اسکی مسکراہٹ میں بہت پریشانی اور جھینپ سی تھی جیسے مسکراہٹ کہہ رہی ہو کہ میں بے ایمان نہیں ہوں۔ میں غریب ہوں، دن رات محنت کرتا ہوں، اپنے سارے گھر کو سنبھالتا ہوں تو بھی کچھ نہیں سنبھلتا۔ کبھی کپڑے لتے نہیں ہیں تو کبھی راشن نہیں ہے کبھی دوا دارو کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ لیکن وہی ہے حالانکہ ورسوا کی آبادی شرنارتھیوں کے آنیسے دس گنی بڑھ گئی ہے اور اسی حساب سے کمپنی کو لابھ بھی ہو رہا ہے

لا یہ بڑھا ہے اور جیب زدگی ڈگر بڑھے ہیں لیکن میری پگار وہی ہے اس میں میری چائے اور بیڑی کے
پیسے بھی نہیں نکلتے سویرے کو رات کے ساڑھے دس بجے تک اس بس میں کھڑا رہتا ہوں۔
اسکی چھت تاکتا رہتا ہوں اور ایک آنہ دو آنہ، ڈھائی آنے اور ساڑھے تین آنے کا ٹکٹ بانٹتا ہوں
یہ اندھیری ہے۔ یہ دروادا رُٹی ہے۔ یہ مچھلی مار ہے یہ دریا محل ہے یہ ورسوا یہ میرے جیون کا چکر
ہے۔ ایک گھنٹی رک رک جائے دو گھنٹی چلے ٹکٹ کاٹو۔ آجاؤ۔ پھر آؤ۔ پھر جاؤ۔

دھرتی کیا ہے۔ نیلا آکاش ہے۔ لہروں پر سفید جھاگ کیسے چمکتی ہے پنڈے کس طرح سمندر
تٹ پر سو جاتے ہیں اور کالی لٹیں کسطرح ریت پر بکھر جاتی ہیں۔ یہ سب پکنک کاٹیج میں آنیوالے
شوقین جانتے ہیں ہم تو پکنک کاٹیج سے گزر جانے والے جھٹکے جیون میں نہ پکنک ہے نہ کاٹیج ہے
اب اگر آپ یہ ڈھائی آنے چھوڑ دیں تو میں سگریٹ، بیڑی، چائے، پانی لے سکوں گا ورنہ . . .

بس کنڈکٹر کی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں میں کھینچ کر دریدر کی ایک لمبی لکیر بن گئی تھی اور اس
کے ماتھے پر پسینے کی بوند جھلکنے لگی تھی۔ اسکی پریشانی دور کرنے کیلئے میں جلدی سے مسکرادیا اور اب
اُسکی مسکراہٹ بھی ایک نئی مسکراہٹ اس طرح کھل اُٹھی جسطرح برساتی پھوار میں یکایک دھوپ
چمک اُٹھتی ہے بس کنڈکٹر سنتوش کی سانس لے کر اور گھوم کر دوسرے مسافروں کا ٹکٹ کاٹنے لگا۔

اندھیری اسٹیشن پر بس رُکی تو میں نے پانچ آنے دے کر چرچ گیٹ کا ٹکٹ کٹایا یہاں پر بھی
دینے والا خود ریل گاڑی کا کنڈکٹر ہوتا تو وہ بھی ضرور کوئی گول مال کرتا مجھے ایک آنہ کا ٹکٹ دیکر اور
چار آنے خود اپنے پاس رکھکر مجھے سیدھا چرچ گیٹ پہنچا دیتا۔ اس بے ایمان سماج میں ایمانداری
دہیں کی جاتی ہے جہاں بے ایمانی کی گنجائش نہ ہو۔ یہ سوچکر میں نے مُنہ کا مزہ بدلنے کیلئے ایک پان
کھایا۔ ایک آنے والے دو گولڈ فلیک سگریٹ لئے ایک سگریٹ جیب میں ڈالا دوسرا منہ میں لگا کر سلگایا۔ اسٹیشن کے
پھل والے کے پاس بڑے عمدہ آم رکھے تھے۔ میں نے زور کا کش لگا کر اُسکا دھواں ان آموں کی

طرف چھوڑ دیا اور "رائل کلاس" میں آکر بیٹھ گیا اور پاس بیٹھے ہوئے آدمی سے اخبار منگا کر پڑھنے لگا۔ اخبار کے ہر پنے پر، ہر کالم میں کسی سیتا لال/ لال ڈیش اور کسی لال خطرے کا الیکھ تھا۔ میں نے سوچا یہ پونجی پتی اخباری ہی سب سے زیادہ کمیونسٹوں کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ مجھے اخبار پڑھتے ہوئے دیکھ ایک سانولے رنگ کے چوڑے چکلے جوان نے کہا کیوں جی یہ شنگائی کے بعد لال سینا آگے کہاں جاتی ہے۔ یہ اخبار کیا کہتا ہے۔؟ میں نے پوچھا کیوں تم کیا لال باوٹے والے ہو۔؟ وہ بولا میں مزدور ہوں۔ میں نے کہا۔ تم ہندوستان میں رہتے ہو پھر چین کی لال سینا سے کیا سروکار ہے؟

اس نے پھر کہا۔ میں اسلئے پوچھتا ہوں کیونکہ میں مزدور ہوں۔ میں نے گمبھیرتا سے کہا۔ تو سنو۔ لال سینا شنگائی سے آگے بڑھ کر بھوچاؤ تک پہنچ گئی ہے اور اس کے بعد اس کی ران پر زور سے ہاتھ مار کر کھینچا۔ او ہو دم چکھا ڈک ڈک۔ اس نے پوچھا۔ اس کے کیا مطلب ہیں؟

میں نے کہا: "جناب مطلب کچھ نہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ میں بہت خوش ہوں۔"

وہ بولا۔ یہ کیا بکواس ہے میں خوش ہوتا ہوں تو سیدھا کہتا ہوں لال باوٹے کی جے۔" میں ہنسنے لگا اور وہ بھی ہنسنے لگا پھر اس نے زور سے میرے ران پر ہاتھ مار کر کہا۔ "بیڑی پلاؤ۔"

میں نے اپنی ران سہلاتے ہوئے اسے گولڈ فلیک کا سگریٹ پیش کیا وہ بہت خوش ہوا اور کہنے لگا: "تم بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ تم سے خوب نبھے گی۔ بتلاؤ میاں بمبئی میں کیا کرتے ہو؟"

میں نے کہا: "میں لیکھک ہوں۔" وہ بولا۔ "تب تو بہت بری حالت ہوگی تمہاری؟"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔ وہ بولا "جب تک روٹی نہ ملے گی کتاب کون پڑھے گا۔ تم کہیں مزدوری کیوں نہیں کر لیتے؟" وہ بولا۔ میں نے کہا۔ "یہ بھی تو مزدوری ہے۔" "میرا مطلب اس طرح کی مزدوری سے ہے جسطرح میں جو میٹرک پاس ہوں۔ بمبئی سنٹرل پر قلی گیری کرتا ہوں، بوجھے اٹھاتا ہوں، محنت [illegible] اور دوسرے مزدوروں میں جاگرتی پھیلاتا ہوں۔ یہ میرے ہاتھ کا نشان دیکھئے۔

جبڑے پر نشان دیکھو ..... اس نے پائجامہ اُوپر کر کے ٹانگ پر گھاؤ کا نشان دکھلایا۔ سب نشان ٹریڈ یونین کی لڑائی کے تمغے ہیں۔" میں نے کہا۔" ہاں بہت مضبوط دکھائی دیتے ہو۔" اُسنے کہا" اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔ پہلے میں بہت تگڑا تھا۔ اب چوٹیں کھا کھا کر جسم اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہے، اب میں کبھی لڑتا ہوں، زور سے چیختا ہوں اور نارے لگاتا ہوں تو کنپٹیاں دُکھنے لگتی ہیں چہرے کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے دودھ پیو اور بادام کھاؤ چھ مہینے تک۔ اب اس اُلّو کو کون سمجھائے کہ پونجی پتیوں کا سماج ہے اسمیں دودھ اور بیکاری ہے۔ ان پڑھ رہنا ہے اور پھر راشٹریہ سرکار ہے۔" میں نے کہا" میں اپنے راشٹریہ سرکار کے ویرودھ ایک شبد بھی نہیں سن سکتا۔" اس نے کہا ابھی جوجوستو کا ایسا پھینٹا دوں گا کہ دماغ کے سارے کھانے کھالی ہو جائینگے۔"

"تم جوجوستو جانتے ہو؟" اس نے کہا" ہاں۔ میں فوج میں تھا اس سے پہلے سپاہی تھا میں ملایا اور برما میں لڑا ہوں۔ جاپانی فاسٹوں کے دودھ، اس کے بعد لڑائی ختم ہو گئی اور میں جو آزادی کا سپاہی تھا۔ آزادی ملتے ہی بیکار ہو گیا۔ اسلیئے ابھی تک میری لڑائی ختم نہیں ہوئی۔ میں ابھی تک فاشسٹوں سے لڑ رہا ہوں۔ اسلیئے مجھے جوجوستو جاننا ضروری ہے۔ اسمیں ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ چوٹ ایک خاص جگہ پر ایسی لگائی جاتی ہے کہ بڑے سے بڑا دشمن چیت ہو جاتا ہے۔ دیکھو ہم ہاتھ کی اس ہڈی سے کام لیتے ہیں" اس نے میرے انگوٹھے کی ہڈی مسلتے ہوئے کہا۔ میں نے کہا "یہ تو بڑی چھوٹی سی ہڈی ہے اور یہاں گوشت بھی کتنا نرم ہے؟" اُسنے کہا۔" یہ بھی ایک سائنس ہے اس چھوٹی سی ہڈی سے انسان کی کھوپڑی تک بھی ہل جاتی ہے۔ تمہیں دکھاؤں؟"

میں نے کہا۔" کھوپڑی نہیں۔ یہاں میرے ہاتھ پر تجربہ کر سکتے ہیں۔ سو اس نے وہی تجربہ کیا اس کے بعد کیا ہوا۔ مجھے پتہ نہیں۔ ہاں جب سینٹرل بمبئی آیا تو میں نے دیکھا کہ میرے پاس بہت سے آدمی کھڑے ہیں اور وہ زور زور سے مجھے سہلا رہے ہیں مجھے ہوش میں آتا دیکھکر کہنے لگا کیوں اب کیا حال،

میں نے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا" میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کامریڈ۔" ڈبولا۔
"کبھی بمبئی سنٹرل آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔ کسی سے پوچھ لینا کہ راجہ قلی کہاں ہے۔ سب جانتے ہیں
لال سلام۔" میں نے کہا" اوں۔ ہوں۔ دم چکھا۔" اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ میں جلدی
سے منہ موڑ کے بیٹھ گیا۔ اسی دم گاڑی بھی چل دی ورنہ جوستو کا دوسرا داؤ مجھے کرانتی کی کسی منزل
پر لے جاتا۔ چرچ گیٹ پہنچکر میں ہارنبی روڈ ود کانکی سجی ہوئی کانچ کی کھڑکیوں کو دیکھتا گیا۔ میں آج
بہت امیر تھا۔ جیب میں چار روپے اور کچھ پیسے تھے اور دکانیں خوبصورت چیزوں سے سجی ہوئی
تھیں۔ آج تو میں ساری بمبئی خرید کرلے جاؤں گا میں نے سوچا۔ یہاں پر گھڑیوں کی نئی دکان تھی
ایک گھڑی ایسی تھی جس کا اوپر سے کوئی پرزہ دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن پھر بھی چلتی تھی۔ میں نے
سوچا۔ یہ ہے پونجی پتی کی گھڑی، سالی کا کوئی پرزہ ٹھیک نہیں ہے تو بھی گھسٹ رہی ہے اُسکے
دام پوچھے تو دکاندار نے ڈھائی سو بتائے، میں نے سوچا آگے چلوں۔ یہاں پر ایک سندھی شرنارتھی
کی دکان تھی۔ ولایتی، ریشمی قمیض شیشوں کی الماریوں میں جگمگا رہی تھیں۔ قیمت بائیس روپے
اٹھارہ روپے، سولہ روپے اور بارہ روپے سے کوئی نیچی نہیں تھی۔

میں آج بہت مالدار تھا پھر بھی یہ قمیض نہیں خرید سکتا تھا۔ آگے وہائٹوے لیڈلا کی کانچ
کی دیواروں میں سے مومی عورتیں پتلے، اُونچے سائے (فراک) پہنے جھانک رہی تھیں آجکل امیر
عورتیں بھی زندگی سے موت کیطرف جا رہی ہیں۔ اُنکے سنگار میں موم کی گڑیوں کا سا ٹھہراؤ ہے
جب ایسا میک اپ ہوتا ہے تو حرکت نہیں جب حرکت نہیں ہوتی جب زندگی نہیں ہوتی جب زندگی نہیں ہوتی
تو بدبو ہوتی ہے جیسے پیرس کا سینٹ بھی نہیں چھپا سکتا جب پیرس بھی نہیں چھپا سکتا تو یہاں کیا
چھپائے گا جہاں بدیسی سمراجیہ کیساتھ سودیسی سوراجیہ کی نعش سڑ رہی ہے۔

سجی ہوئی دکانوں پر ریشمی کپڑے تھے قمیضیں، گرم بلوزیں، گھڑیاں، فونٹین پن، بُوٹ، جرابیں، رولڈ

چینی کی پلیٹیں، برساتیاں، گلیچے (غالیچے) اور گلدان موجود تھے اور یہاں پھولدان تھے لیکن پھول نہیں تھے اور پل نہیں تھے۔ پھاوڑے۔ درانتیاں، ٹرکٹرس، کراس بار، ریخ او ساسپنڈل نہیں تھے ہاربنی روڈ پر اناج نہیں ملتا، پھول نہیں ملتے۔ بچوں کی کتابیں نہیں ملتیں۔ کام کی مشینیں نہیں ملتیں، کوئی بھی کام کی چیز نہیں ملتی۔ میں چار روپے لیکر آیا تھا مگر یہاں تو داؤں بہت اونچے ہیں جتنے اُونچے داؤں، اتنے اُونچے دام، اتنا اونچا لام اور اتنی گہری غریبی غریبی کا خیال آتے ہی یہ خیال بھی آتا کہ صبح سے بے کار گھوم رہا ہوں۔ ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ فورٹ میں فیروز شاہ لہنا روڈ ایک تنگ سی گلی میں ایک مدراسی ہوٹل کا پتہ لگایا تھا یہاں بہت اچھا اور سستا کھانا ملتا ہے نو آنے میں دہی دو سا مصالحہ، میسور پاک کھا کے اُوپر سے ایک میٹھا مدراسی پان چبا کے جس کا مزہ کیلے کے پتے جیسا ہوتا ہے سنتشٹ کی ڈکاری۔ اس کے بعد ہاربنی روڈ سے گھومتا ہوا میں وکٹوریہ ٹرمینس کیطرف چلا گیا۔ وکٹوریہ ٹرمینس بہت اچھی جگہ ہے۔ بمبئی میں یہاں ایک طرف سینما ہال ہے۔ دوسری طرف اسٹیشن ہے تیسری طرف فوجی عدالت ہے۔ بیچ میں نیتاؤں کے بت ہیں جن کے اوپر فرشتے پر پھیلائے کھڑے ہیں۔ چوتھی طرف خالی ہے جہاں اگر شیطان کا بت کھڑا کر دیا جاتا تو آج کے سماج کی چوتھی چول بھی بیٹھ جاتی لیکن پھر خیال آیا کہ راشٹریہ سرکار کے ہوتے ہوئے اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سینما ہال کے پیچھے ایک بہت بڑا خالی میدان ہے جہاں انگریزی راجیہ میں پولیس کی پریڈ ہوا کرتی تھی۔ آجکل یہاں کھدر کی نمائش ہوتی ہے اور ایکبار انتر راشٹریہ نمائش بھی ہوئی تھی جسمیں بدیسی دنیا کے ہر ایک دیش کے لوگوں نے حصہ نہیں لیا تھا تو بھی کم سے کم ان دیشوں کے جھنڈے ضرور تھے تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ ہندوستان ہی ایشیا کا رکشک نیتا بن سکتا ہے۔ بمبئی کی یہ نمائش تھوڑے دنوں تک رہی پھر چل گئی۔ دلی والی نمائش ابھی تک نہیں چلی اس کیلئے شاید واجد علی کو بلانا پڑے گا۔

کھانا کھانے کے بعد میں ہمیشہ آرام کرتا ہوں اس لئے میں اس میدان میں پڑ کر سو گیا۔ میرے سر کے اُوپر گل داؤدی کا ایک پیڑ تھا جسمیں لال کمیونسٹ پھول کھل رہے تھے ان پیڑوں کی ٹہنیوں پر لال دُم والی چڑیا شور مچا رہی تھی اور ایک گجراتی لڑکی لال پھولدار ساری پہنے جا رہی تھی اور سیما کی دیواروں لال شبدوں میں لکھا ہوا تھا READ SHELETONIN RED HOUSE اس لال خطرے کے نیچ میں یہ میری ہمت تھی کہ آنکھ بند کر کے سو گیا۔ پتہ نہیں میں کتنی دیر تک سوتا رہا لیکایک میں گھبرا کے جاگ گیا کسی نے بڑے زور سے میری کمر میں ٹھونکا دیا تھا دیکھا تو ایک چوکیدار کھڑا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟" وہ بولا "تم یہاں سو نہیں سکتا" میں نے کہا "کیوں نہیں سو سکتا ہے؟" - "ہم بولتا ہے نہیں سو سکتا۔" اس نے کہا۔

میں نے اس کی ہتھیلی پر آٹھ آنے رکھ دیئے۔ اور پوچھا اب سو سکتا ہے کہ نہیں؟ اس نے اٹھنی جیب میں رکھی اور مسکرا کر کہنے لگا "سونے کو سکتا ہے۔" میں نے پوچھا "تمہاری ڈیوٹی یہاں کب تک ہے۔" وہ بولا۔ "دو کلاک (گھنٹے) اور ہے۔"

میں نے کہا "میں دو کلاک اور سوتا ہوں۔ تم اس پیڑ کے نیچے کھڑے ہو کر پہرہ دو اور دیکھو کوئی دوسرا چوکیدار مجھے تنگ نہ کرے دو کلاک کے بعد جگا دینا۔ میں تمہیں ایک اٹھنی اور دوں گا سمجھے۔" اس نے سر ہلا کے کہا "ہوں۔" وہ پیڑ کے تنے سے سہارا لگا کر کھڑا ہو گیا اور میں سو گیا۔ دو گھنٹہ کے بعد اُسنے مجھے جگایا اور کہا "اٹھو ہمارا ڈیوٹی ختم ہے دوسرا چوکیدار آنے کو ہے۔"

میں نے اسے دوسری اٹھنی دے کر کہا "شاباش تم نے بہت اچھا کیا اب بتاؤ تم یہاں سے اپنے گھر جاؤ گے؟" "ہاں" اس نے کہا۔ "تمہارے کتنے بچے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"دو۔ ایک لڑکا ہے، اسکول جاتا ہے ایک لڑکی ہے دو سال کی۔ آج میں اس کے لئے ولایتی دودھ کا ڈبہ لیکر جاؤنگا" اس نے خوش ہو کر کہا۔

میں نے کہا "جو بیگار تمہیں ملتی ہے کیا اس میں تمہارا گذارہ نہیں ہوتا؟" وہ بولا "اگر گذارہ ہوتا تو کیا ہمارا بھیجا پھرا ہے کہ دو گھنٹے تمہاری ڈیوٹی دیتا ہوں۔" چوکیدار ناراض ہو کر چلا گیا۔

میں میرٹو سیتما کیطرف بڑھ گیا جہاں مرغی خانوں کیطرح شرنارتھیوں کیلئے لکڑی کی چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ ان دکانوں پر ادھک تر پرانا (سیکنڈ ہینڈ) مال ملتا ہے۔ پرانے جوتے، پرانی مشینیں پرانے کپڑے شرنارتھیوں کیطرح گھسے ہوئے اور بُرے حال اور دو تین سندھی ریسٹوران بھی ہیں۔ جہاں چائے آلو کی ٹکیاں اور پاپڑ ملتے ہیں۔ میں نے چائے والے کی دکان سے ایک تلا ہوا انڈہ کھایا۔ آلو کی ٹکیاں جہاں تھیں۔ دو آنے میں آلو کی ایک ٹکیا کھائی پھر دو آنے کی بھیجیا (پکوڑے) اور دو آنے کی پاپڑی کھائی۔ ایک آنہ کی چائے پی۔ میدان میں سونے سے بال اُلجھ گئے تھے اس لئے دو آنے کا پرانا کنگھا خریدا اور اسے بالوں میں پھیرتا ہوا آگے نکل گیا تو آواز آئی۔

"آ پتر کھانا کھالے۔" میں نے دھیان سے دیکھا۔ ایک پنجابی بڑھیا تھی بال سفید، چہرے پر جھریاں اور دھوپ، ورشا، محنت اور دکھ کے نشان تھے۔ دوپٹہ میلا تھا لیکن چہرے پر اداس اور دکھ بھری مسکراہٹ تھی جو دل کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ وہ یہاں ایک چھوٹی سی دکان لگائے بیٹھی تھی۔ ایک طرف توا رکھا تھا۔ پرات تھی۔ چمٹا تھا۔ چولہا تھا اور ہنڈیا میں سالن تھا۔ آٹا گوندھ رکھا تھا۔ وہ چپاتیاں اتار کر دو مسافروں کو کھلا رہی تھی۔ میں رُک گیا۔ مجھے رُکا دیکھ کر اس نے میلے دوپٹے کو اپنے ماتھے پر سرکا لیا اور مسکرا کر بولی۔ "آ پتر روٹی کھالے، تو پنجابی معلوم ہونداایں۔" میں نے جھجک کر اس سے اندر جا کر پوچھا۔ ماں تو یہ کام کیوں کرتی ہے۔؟

وہ بولی۔ "اور کیا کروں بیٹا، مجھے یہی کام آتا ہے۔ میں نے زندگی بھر اپنے گھر والوں کا کھانا پکایا ہے۔ اب اپنے مسافر بیٹوں کے لئے کھانا پکاتی ہوں۔" میں نے کہا "ماں تم کہاں کی رہنے والی ہو؟"

"پتر! میں جالندھر کی رہنے والی ہوں۔ وہاں میرا گھر تھا۔ میری زمین تھی۔ میرے بال بچے تھے۔

میری بہو تھی۔ میری گائیں بھینسیں تھیں۔ گھر دودھ شکر عزت آبرو سب کچھ تھا لیکن میری گلی کے بیٹوں ہی نے میرا سب کچھ لوٹ لیا" میں نے کہا۔ "ماں تم پاکستان کیوں نہیں چلی جاتیں۔؟"

اس نے کہا۔ میرے بچوں کی قبریں اسی جالندھر کے چوراہے پر ہیں جہاں میرے گھر والوں کو زندہ آگ میں جلا دیا گیا تھا۔ میری بہو کی لاج اور پت بھی ہندوستان میں رو رہی ہے میری گائیں بھینسیں بھی میرے ہی جاننے پہچاننے والے لے گئے ہیں اور میرا گھر ابھی تک جالندھر میں ہے اس میں شہر کا کوئی بڑا آدمی رہتا ہے۔ میری لڑائی تو اپنے لوگوں سے ہے میں تو یہیں رہوں گی یہیں مروں گی اگر میں بیراں دتے کی بیٹی ہوں تو ایک روز جالندھر پھر واپس آجاؤنگی۔

اتنے میں ایک مسافر اور آگیا اور کہنے لگا۔ اماں دو آنے کا سالن دے دو۔ اور دو روٹیاں دے۔

میں بھی ایک کونے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ بھنے ہوئے گوشت کا سالن تھا اور گرم گرم روٹی بڑا مزہ آیا۔ میں نے کہا۔ اماں۔ تم یہاں ایک تندور لگا لو بس۔ وہ بولی تندور کیلئے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے بیٹا۔ اب میرے ہاتھ پاؤں میں طاقت نہیں رہی ہے وہ چپ ہو کر چولہے پر چپاتی سینکنے لگی اور اس کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ آگئی اور پھر دھیرے سے بولی۔ جالندھر میں گھر کے آنگن میں میں نے تندور بنایا تھا وہاں میری بہو دوپہر میں گیہوں کی ایسی گرم اور خستہ روٹیاں پکاتی تھی اگر تم کھاتے تو پشاور کے نان بھول جاتے۔ یکایک اُسکی آنکھ بھر آئی اور بولی پتہ نہیں آجکل وہ جنم جلی کہاں ہے۔ اماں رونے لگی۔ اسکی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور توے پر گر گر سوکھتے گئے۔ یہاں آنسوؤں کی پکی ہوئی روٹیاں میٹرو سینما کے سامنے صرف دو آنے کی ملتی ہیں۔

سوچ رہا ہوں۔ کسی روز ایشیا کے سب سے بڑے نیتا پنڈت جواہر لال نہرو کی یہاں دعوت کرونگا

میٹرو سینما کے باہر ایسے چمکتے چہرے تھے۔ ایسی بھڑکیلی پوشاکیں تھیں۔ ایسی جگمگاتی ہوئی بجلیاں تھیں۔ ولیم پال ادھ ننگی عورتوں میں گھرا ہوا تھا۔ مرد خوب صورت کپڑے پہنے ہوئے،

موٹروں سے اتر کر ان عورتوں کو اسطرح گھور رہے تھے جیسے اپنے دانتوں سے چبا جائینگے آنکھوں میں وہ بھوک تھی وہ گرمی تھی جو پکار پکار کر کہہ رہی تھی اگر یہ عورتیں زندہ ہوتیں تو یہ لوگ انہیں اشاروں سے نیچے اُتار کر یہیں میٹرو سینما کے سامنے سب کے سامنے ان کی لاج لوٹ لیتے ہالی وڈ نے اس بھاؤ کا نام "انٹرٹین مینٹ" رکھا ہے اور اب یہ انٹرٹین منٹ ہندوستانی فلموں میں اسطرح گھس آئی ہے جیسطرح ڈالر ہندوستانی ارتھ شاستر میں گھس آیا ہے اور گھٹیا امریکی ناول ہندوستانی سبھیتا میں گھس آیا ہے۔ سماجی جیون کے ہر انگ میں وبھیچار کا سمرتھک ہے۔ سُندرتا، سچائی، پوترتا، شانتی، علاج، گھر، خوشی، کتاب، پھول، آرام اتیادی سب چیزوں کو وہ ننگا کر کے اسے وبھیچار کرتا ہے۔ اسکے بعد اسے مہنگے، سستے داموں بازار میں لاکر بیچ دیتا ہے۔

چیز کی عزت نہیں ہے۔ چیز کی قیمت ہے جو ہمیشہ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ کبھی انفلیشن ہے تو کبھی ڈفلیشن ہے۔ انت میں سدا یدھ ہے جو کہ شانتی کے ساتھ ایک طرح کا وبھیچار ہے۔

ابھی کھیل شروع ہونے ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا لیکن دس آنے کی ٹکٹ خریدنے والے شائقین کی ایک لمبی لائن لگی ہوئی تھی۔ میں بھی جا کر "کیو" میں کھڑا ہو گیا۔ میرے بعد ایک دبلی پتلی کالی لڑکی آئی جو پھولدار چھینٹ کا ایک تنگ فراک پہنے ہوئے تھی۔ یہ فراک اُوپر سے تنگ تھا۔ اور نیچے سے گھیر دار تھا۔ بیچ میں اُسنے زور سے خوب کھینچ کر ایک پیٹی باندھ رکھی تھی جس سے اُسکے شریر کے دو حصے ہو گئے تھے ایک دھڑ سے اُوپر اور ایک دھڑ سے نیچے۔ اسکا نام یاروں نے "خوبصورتی" رکھا ہے۔ یعنی عورت پیٹی کے کھنچاؤنے سے اور اُونچی ایڑی کے دباؤ سے یوں چلتی ہے کہ اوپر کا حصہ نیچے اور نیچے کا اوپر جاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ سینہ پر چھاتیاں اپنی اصلی حالت میں نہیں بلکہ یوں تنی ہوئی دکھائی دیتی ہیں کہ جیسے کسی نے رنچ سے پیچ کس دیئے ہوں۔ اس کے بعد چہرہ یوں لپا پتا ہوتا ہے کہ معلوم ہی نہیں ہو سکتا کہ کتنے چھلکوں کے بعد بادام کا مغز آتا ہے

اور کتنی تھوں کے بعد عورت شروع ہوتی ہے۔ اس ڈھکوسلے کا نام فلموں والوں کی اُپج نے "سندرتا" رکھا ہے۔ کئی لوگ تو اُسے "کلا" بھی کہتے ہیں جو سراسر کلاکاروں کا اپمان ہے۔

خیر وہ ایسی ہی لڑکی تھی۔ میں نے اُسکی طرف دیکھا اُسنے میری طرف نہیں دیکھا پھر اُسنے اس سمے دیکھا جب میں نے اُسکی طرف نہیں دیکھا۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کیطرف ترچھی نظروں سے دیکھا بعد میں یہ ترچھی نظریں دھیرے دھیرے ہوتے ہوتے یوں آمنے سامنے ہو گئیں کہ ہمیں مسکرانا ہی پڑا۔ اُسکے بعد میں نے کہا: "بڑا لمبا کیو ہے، جانے ہماری باری آئے گی یا نہیں۔؟"

وہ بولی: "تمہاری باری تو شاید آجائے گی لیکن ہماری نہیں آئے گی۔" میں نے کہا: "اگر ہماری باری آگئی تو اپنا ٹکٹ میں تمہیں دے دوں گا۔" اس نے اپنے کندھے پر لٹکتے ہوئے بٹوے کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا: "تھینک یو۔" میں نے کہا: "اب تو یہ پوچھنا کوئی حرج نہیں ہے کہ تمہارا نام کیا ہے۔؟" "ڈائنا فرنیڈس اور تمہارا۔؟" اس نے کہا۔

"میرا نام کرشچین چندر ہے۔"

وہ ہنسی: "یہ کرسچن کیا ہوتا ہے۔؟"

میں بولا: "بس جیسے ممتاز شانتی ہوتی ہے۔ سید امرت ہوتا ہے بس ایسے ہی میرا نام ہے۔"

وہ بولی: "تم بڑے فنی (FUNNY) ہو۔" میں نے کہا: "تم چائے پیو گی؟ سامنے کے ایرانی ریسٹوران میں۔" "چلو، لیکن پھر کیو میں جگہ نہیں ملے گی۔" اس نے کہا۔

"کیوں نہیں ملے گی۔" میں نے کہا۔ میں ابھی اپنے آگے کے آدمی سے کہے دیتا ہوں اور تم اپنے پیچھے والے سے کہہ دو۔"

جب ہمیں کیو کے پڑوسیوں نے اجازت دی تو ہم لوگ ریسٹوران میں چائے پینے کے کیلئے چلے گئے۔ چلتے چلتے میں نے سنا کہ ہمارے پڑوسی کہہ رہے تھے کہ "سالا پٹا رہا ہے۔"

دوسرے نے کہا۔" لڑکی بھی کیا ہے کالی بطخ ہے۔"

پہلے نے کہا۔" ارے لڑکی تو ہے۔؟"

ڈانانے کہا۔ سوائن۔

چائے پی چکے تو ڈانا نے کہا۔ میں پٹاٹو چپس کی ایک پڑیا گھر لے جاؤں گی، دو آنے وہ دیئے۔ پھر وہ کہنے لگی۔ مجھے بالوں میں لگانے کیلئے ہرے رنگ کا کلپ چاہیئے۔ چار آنے وہ دیئے پھر وہ کہنے لگی تو میں اُسکے کہنے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ چلو، بکنگ آفس کھل گیا ہے بعد میں ٹکٹ نہیں ملیگا۔ ٹکٹ لیکر ہم لوگ اندر پہنچے۔ سینما دیکھتے ہوئے ڈانا نے مجھ سے ایسا ویوہار کیا کہ سچ مچ میں اُسے پیار آرہا تھا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی میری طرف دیکھ کے ہنسی اور دو تین بار اس نے چٹکی لی۔ جب اس کے بعد بھی میں اپنا اپنا ہی ٹالتا رہا تو اُسنے میرے کندھے پر اپنے رُوکھے بالوں والا سر رکھ دیا اور آرام سے بیٹھ کر تماشا دیکھنے لگی۔ سینما ختم ہونے کے بعد اُسنے مجھ سے پوچھا۔ اب کہاں جائیں گے۔؟

میں نے کہا کہیں نہیں۔ تم اپنے گھر جاؤ گی میں اپنے گھر۔ وہ میری طرف حیرت سے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔ تمہارا گھر کہاں ہے۔؟" کوبالا میں۔" اس نے کہا۔

" چلو میں تمہارے گھر تک چھوڑ آؤں۔" وہ اُکھڑے اُکھڑے انداز میں پریشان ہوکر چلنے لگی جیسے وہ کچھ سمجھ رہی ہو۔ میں بھی کچھ نہیں سمجھ رہا تھا۔ اور ہم دونوں انہیں وچاروں میں اُلجھے ہوئے نکڑ کے بجلی کے کھمبے کے نیچے بس کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں ہلکی ہلکی بارش ہونے لگی اور پانی کے موتی اس کی جھکی ہوئی پلکوں پہ اٹکتے گئے۔ اور ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے گالوں پر بہتے گئے کیا ان بہتے ہوئے موتیوں اس کے آنسوؤں کا بھاؤ بھی ملا ہوا تھا؟ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ اب بارش تیز ہونے لگی تھی۔ اور اوپر بجلی کے بلب سے تیار ہوا ایک پگھلی ہوئی آگ کیطرح گر رہا تھا اور یکایک مجھے ایسا لگا

کہ اس تیز بارش نے اس کی ساری بدصورتی دھو دی ہے۔ اُس کے کالے بال چمک اُٹھے۔ اس کے بھیگے ہوئے گال تمتما گئے۔ اور بارش کے لگاتار چھینٹوں سے اس کے کاسنی ہونٹ ریشم کیطرح ملائم ہو گئے یوں کھل اُٹھے جیسے بارش کی ہلکی پھوار سے پھول کھل جاتے ہیں۔ اور بجلی کے ہنڈے کے چاروں اور روشنی کا کنڈل بن جاتا ہے اور سرمئی سڑک پگھلی ہوئی چاندنی پھیل جاتی ہے۔ اس طرح بارش نے کھمبے کے نیچے ایک اُداس تراش لڑکی امٹ سُندرتا کی سنہری پوشاک پہنا دی۔

میں نے ڈائنا کو اپنے کندھے سے لگا لیا۔ اس کا اُداس چہرہ اُس وقت بہت سندر تھا اور اس کے کالے بالوں کی لٹیں بھیگی ہوئی کسی انجانی سوگندھ سے مہک اُٹھیں۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ "گڈ بائی ڈائنا۔" وہ وہیں لگی رہی اور بولی تم مجھ سے پریم نہیں کرو گے۔؟"

میں نے اس سے کچھ نہیں کہا لیکن میں نے اپنے دل میں یہ ضرور کہا۔ نہیں، میں تجھ سے پریم نہیں کروں گا۔ آج تم گھر جاؤ گی کلابے اپنی ماں کے پاس، اپنے چھوٹے بھائی کے پاس اور اس کی سچی محبت کا انتظار کرو گی جو تمہاری زندگی میں آنے والی ہے۔ وہ ضرور آئے گی ایسے بیکار ڈھونڈنے سے۔ پرائے مردوں کے ساتھ گھومنے سے وہ محبت نہیں آتی ہے وہ محنت اور کام کرنے سے آتی ہے۔ جہاں سے وہ محبت آتی ہے وہیں سے وہ سندرتا آتی ہے جو محنت سے پیدا ہوتی ہے۔ پھر تم سچ مچ سُندر حسین ہو جاؤ گی۔ اور کوئی مرد کوئی کام کرنے والا جو شاید کوئی موجا، ڈی۔ سلوا" ہو گا تمہیں بیاہ کر لے جائے گا۔ اور پھر تم اپنا چھوٹا سا گھر بساؤ گی اور تمہیں معلوم ہو گا محبت اس لئے ہوتی ہے کہ ماتا ہو اور ممتا اس لئے ہوتی ہے کہ بچہ ہو اور بچہ اسلئے ہوتا ہے کہ انسان آگے بڑھے اور دنیا میں ایک نئی سندرتا، ایک نیا جیون پیدا ہو۔ جاؤ ڈائنا جاؤ۔ میں نے ڈائنا کے ماتھے کو چوم کر کہا۔

ڈائنا کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ میری کہی ہوئی باتیں کچھ سمجھی لیکن چونکہ وہ عورت تھی

اس لئے بہت کچھ سمجھ گئی اس نے بڑے تپاک سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں نے چلتے چلتے کہا۔

جیب تمہارے گھر بیٹا ہو تو ڈاانتا، تو آج کی رات کی یاد میں اُسکا نام "کرشمین چندر" رکھنا وہ چلتے چلتے ہنس پڑی اور ہنستے ہنستے بولی نہیں میں اس کا نام "ولیم پاول" رکھوں گی۔ کتنا خوبصورت آدمی ہے۔

گڈ نائٹ ڈاانتا۔

گڈ نائٹ کرسچن۔

پیسے سب ختم ہو چکے تھے جیب میں صرف دو پیسے تھے اور ایک گڈ فلیک کا سگریٹ گاڑی میں بنا ٹکٹ بیٹھا۔ باندرا کے قریب مجھے ایک ٹکٹ چیکر نے بھانپ لیا اور مجھے گاڑی سے نیچے اتار دیا۔ میرے پاس رشوت کے پیسے بھی نہیں تھے۔

کچھ تو نکالو آخر تنگ آکر ٹکٹ چیکر نے کہا۔ جب اس نے کہا کچھ تو نکالو میں نے اس کے چہرے کو دیکھا جس پر بے ایمان سماج کے داغ تھے اور نیکی کو قائم رکھنے کی اپنی کر کوشش کی تھی ٹکٹ چیکر کا چہرہ ٹکٹ چیکر کی رسید بک تھا جسے جگہ جگہ پر پنچ کر دیا گیا تھا۔ میں نے کہا۔ میرے پاس دو پیسے ہیں۔ اس نے جھلا کر کہا تو تھانے چلو۔

میں نے ان کے کوٹ کو دیکھا جس کا کالر پھٹا ہوا تھا۔ پتلون جو پائنچے کے پاس اُدھڑ گئی تھی۔ ٹائی جو گانٹھ کے پاس پھٹی ہوئی تھی پتلے سوکھے ہونٹ، ارمانوں کا تار تار، قمیض کے کفوں میں بٹن تک نہیں تھے یکایک مجھے اپنی قمیض کا خیال آیا۔ میری قمیض میں سنہری بٹن تھے۔ کبھی دو روپیہ آنے میں لئے تھے۔ میں نے اپنی قمیض کے کف کے بٹن اتارے اور اسے دیدیئے۔

اس نے لے لئے اور کہا۔ چلو یہی سہی۔

پھر اس نے مجھے دھمکاتے ہوئے کہا اگر پھر کبھی تم مجھے بنا ٹکٹ سفر کرتے ہوئے پائے گئے

تو۔ "تو" میں نے کہا۔ کہنے لگا۔ بابو تم سب کچھ جانتے ہو۔ نو سے روپیہ تنخواہ ملتی ہے اس میں گذر بسر نہیں ہوتی اور کوئی داد فریاد سننے والا نہیں ملے۔ گاڑی نے سیٹی دی۔ میں بھاگ کر فٹ بورڈ پر چڑھ گیا۔ ٹکٹ چیکر دیر تک ہاتھ ہلاتا رہا۔ اندھیری اسٹیشن پر اتر کر ٹیکسی کے پیسے نہیں تھے۔ بس جا چکی تھی۔ عرصہ ہوا۔ گھوڑا گاڑی والے بھی دو روپے مانگتے تھے راستہ تو بہت لمبا نہیں تھا لیکن رات کا سمے تھا اور راستہ ویرانی سے گذرتا تھا مگر روپے نہیں تھے۔ مجبوری تھی اسی لئے پیدل چلنا پڑا۔ پھر ڈاولڑی سے شروولد تک میں سیٹی بجاتا ہوا آیا۔ یہاں تک کچھ گھروں کی آبادی تھی اس لئے سیٹی کی آواز بھی اطمینان سے نکلتی تھی لیکن "شروولد" کے بعد قبرستان سے جو سنسانی شروع ہوئی تو سیٹی کی آواز ایک دم گلے نکلتی بند ہو گئی۔ نہ کوئی مسافر تھا نہ کوئی موٹر گاڑی نظر آتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف نیچی زمین تھی اور کنارے کنارے گھنی جھاڑیاں اُگی تھیں۔

مندر تک تو میں خاموش چلا آیا پھر ہلکی ہلکی پھوار پڑنے لگی۔ میں نے برساتی اوڑھ لی۔ جب میں برساتی اوڑھ رہا تھا تو کسی نے مجھے پیچھے سے آکر پکڑ لیا اور کہنے لگا جو کچھ ہے رکھ دو ورنہ مار ڈالوں گا۔

میں نے کہا۔ جو کچھ ہے تم خود ہی لے لو نا۔ میں کچھ کہوں گا تو تمہیں کیوں وشواس آنے لگا۔

کتنے پیسے ہیں تمہارے پاس۔؟

دو پیسے اور ایک گولڈ فلیک کا سگریٹ کُل ملا کر ڈیڑھ آنہ ہوا۔

جھوٹ بولتے ہو۔ اتنا کہہ کر اس نے میری جیب کی تلاشی لے ڈالی جب کچھ نہیں نکلا تو جھنجھلا کر کہنے لگا۔

یہ برساتی اُتار دو۔

میں نے برساتی اُتار کر اسے دے دی۔ اس نے میری برساتی اوڑھ لی۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی ایک موٹی سی سلاخ تھی ہم دونوں سڑک پہ دھیرے دھیرے چلتے گئے وہ مجھ سے

دوگنا لمبا اور کہیں طاقتور آدمی تھا اسلئے شریفوں کی طرح چلنے میں ہی بھلائی تھی۔
میں نے اس سے پوچھا "سگریٹ پیو گے۔؟"

"ہوں،" اس نے جواب دیا۔ یہ ہوں ہاں بھی ہو سکتا ہے اور نہ بھی
میں نے سگریٹ کے دو ٹکڑے کئے اور ایک ٹکڑا اسے دیدیا۔ سگریٹ پیتے پیتے
میں نے اس سے پوچھا تم یہ کام کیوں کرتے ہو؟

نہ کروں تو کھاؤں کہاں سے؟ وہ چپ ہو گیا اور میرے ساتھ چلتا گیا پھر جھنجھلا کر بولا۔
آج کی رات خالی گئی جانے مسافروں کو کیا ہو گیا۔ سبھی خالی ہاتھ آرہے ہیں۔
میں نے کہا۔ تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟
کام تو کرتا ہوں، پتھر کی کھان میں کام کرتا ہوں مگر اس مزدوری سے کچھ پلے نہیں پڑتا گھر
ہر سمے بھوک رہتی ہے۔ بڑا کنبہ ہے، تنخواہ چھوٹی ہے اس لئے یہ کام کرتا ہوں۔
اس کام میں تمہیں کتنی آمدنی ہو جاتی ہے؟
کبھی پانچ، کبھی سات، کبھی کوئی سیٹھ ہاتھ لگا تو سو پچاس مل جاتے ہیں۔ یہ دھندا برا
نہیں۔ "چار ٹکے" کے نکڑ پر پہنچ کر اس نے کہا۔ میرا جی تو نہیں چاہتا کہ یہ کام کروں مگر کیا کروں
اس کا کوئی علاج میری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں نے کہا آؤ دو منٹ کیلئے میری بنچ پر بیٹھ جاؤ۔" اس
نے مجھے مشتبہ نظروں سے دیکھا۔
میں نے کہا یہاں اس سمے کوئی نہیں ہے۔ میں کسی کو پکار نہیں سکتا اس لئے تم اس لوہے
کی سلاخ سے ختم کر کے یہاں سے بھاگ سکتے ہو اسلئے شبہ کرنا بیکار ہے۔ یہاں آؤ بیٹھ جاؤ
اس نے لوہے کی سلاخ اٹھا کر گود میں رکھ لی۔ اور بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے کہا ایک راستہ
ہے اگر تم اسے پسند کرو تو۔ "وہ کیا؟"

ایک منٹ کے لئے مان لو کہ جس پتھر کی کان میں تم کام کرتے ہو تمہاری ہو جائے اس کا چہرہ چمک اُٹھا اور بولا یہ کھان کے مالک کے گھر ایکبار چلا گیا تھا، کتنا خوبصورت تھا! روشنی پھول سونے کا..... وہ آنکھ بند کرکے کلپنا میں اس کا گھر دیکھنے لگا۔

میں نے کہا تم سمجھتے نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ کان صرف تمہاری نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کی ہو جائے۔ جو اس میں کام کرتے ہیں۔ سارے مزدور اور محنت کرنیوالوں کی۔ اس نے سوچ کر کہا۔ جب بھی ہمیں بہت فائدہ ہے وہ دھیرے دھیرے لوہے کی سلاخ سہلانے لگا۔ میں نے اس سے پوچھا تم نے کبھی کان کے مزدوروں سے بات چیت کی ہے؟ نہیں اس نے مجھ سے کہا۔ وہاں تو ہر آدمی اپنی تقدیر کو روتا ہے۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ تقدیر بھی بدل جاتی ہے جب سب مزدور مل جاتے ہیں۔ تم لوگ تو زندگی کی سچائی ہو تو سوچو تو دراصل وہ کان تمہاری ہے۔ اس میں کام تم کرتے ہو۔ پہاڑ میں بارود کا فیتہ تم لگاتے ہو چٹان کو ڈائنامیٹ سے تم اُڑاتے ہو۔ پتھروں کو تم توڑتے ہو۔ پتھر کاٹ کر لاری میں تم لادتے ہو۔ جب ساری محنت تم کرتے ہو تو اپنی ساری محنت کا پھل کسی دوسرے کو کھانے کو کیوں دیدیتے ہو؟ میری بات سنتے سنتے اسکا چہرہ لال ہو گیا وہ سلاخ سہلا رہا تھا۔ سہلاتے سہلاتے اُسنے زور لگا کے اُسے دوہرہ کر دیا اس نے کہا۔ یہ بالکل تم نے نئی بات بتائی ہے۔ میں نے کہا یہ نئی بات نہیں یہ سو سال پرانی ہے آزمائی بھی جا چکی ہے۔ وہ سلاخ اُٹھا کر اُٹھ بیٹھا۔ بولا ہم بھی آزما سکتے ہیں، کل میں اپنے ساتھیوں سے بات کرونگا اور بتاؤں گا۔ کل تم مجھے یہاں ملو گے اسی وقت؟

میں نے اسکی بات پر سر ہلا دیا اُسنے میری طرف غور سے دیکھا لوہے کیطرف دیکھا پھر اُسنے مسکرا کر لوہے کی سلاخ کو گھما کر دور نیچے بھرے ہوئے پانی میں پھینک دیا۔ پانی میں ایک ہلچل پیدا ہوئی جیسے کوئی چیز ڈوب جائے اور نئی چیز ابھر آئے اس نے ہاتھ بڑھا کر میرا ہاتھ دبا دیا اور...

پھر اس نے ایک بیڑی سلگائی۔ برساتی اتار کر میرے کندھے پر رکھ دی اور خود بارش میں بھیگتا ہوا چلا گیا۔

مجھے کسی سے نفرت نہیں ہے

ایک عرصہ سے ملک صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، آخری بار کوئی تین ماہ ہوئے جب وہ مجھ سے ملے تھے تو ایک فلم کمپنی بنانے کے چکر میں تھے۔ اسکے بعد ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ آج صبح صبح ناشتے پر مجھے ان کا خیال آیا تو میں نے سوچا چلو دادر میں چل کے انہیں دیکھا جاؤں اُلکا چکر کسی منزل پر ہے۔

دادر میں ملک صاحب کے گھر پہنچا تو وہ گھر پر نہیں تھے۔ بھابی نے بتایا وہ آفس گئے ہیں۔

"آفس کہاں لیا ہے۔؟"

"او بیرا ہاؤس کے قریب، دائیں طرف گلی میں جو لال جی بھائی مول جی بھائی دھو کے والا کی بلڈنگ کا بڑا پھاٹک ہے نا۔ اس کے اندر پہلی منزل پر۔" میں نے دل میں سوچا چلو بہت اچھا ہوا۔ آخر ملک صاحب نے اپنی فلم کمپنی بنا ہی ڈالی۔ میں ان کے آفس جا کر مبارکباد ہی کیوں نہ دے آؤں۔ یہی سوچکر میں کرسی سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکلا تو بھابی نے کہا۔ "چائے پی کر جائیے نا!" میں نے پوچھا۔ گھر میں چینی ہے۔؟ چینی۔ بھابی نے خفا ہو کے کہا چینی تو نہیں ہے آپ کو معلوم ہے راشن سے ملتی ہے اور بہت کم ملتی ہے اگر آپ کو چائے یہاں پینا تھی تو کم از کم چینی تو گھر سے لے آتے۔ "آئندہ احتیاط برتوں گا" یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔ بھابی دروازے پر کھڑی تھیں، چلتے چلتے زینے سے ٹھوکر لگی تو گھبرا کے بولیں۔ آپ بھی غضب کرتے ہیں احتیاط سے اترئیے نا۔ یہ زینہ بہت کمزور ہے کہیں ٹوٹ گیا تو مالک مکان دوبارہ بنوا کے نہیں دے گا۔ میں چپ چاپ اپنا گھٹنا سہلاتا نیچے اتر گیا دراصل ان معاملوں میں زیادہ بات کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ ورنہ میں بات بھی کر سکتا تھا مگر ان معاملوں میں بھابی کا ذوق بھی وہی ہے جو میری بیوی کا ہے۔ میری

بیوی کو اگر گھر میں کوئی مہمان آجائے تو مہمان سے زیادہ چائے کے برتنوں کا خیال ہوتا ہے۔ ہائے کہیں مہمان کی بد احتیاطی سے چائے کے برتن ٹوٹ ہی نہ جائیں۔ اسی خدشے سے وہ مہمانوں کو اکثر چائے کیلئے پوچھنا ہی بھول جاتی ہیں۔ اور اگر کہیں بد قسمتی سے مہمان دوہرے بدن کا مالک یعنی بھاری بھرکم ثابت ہوا تو گھر میں فالتو چارپائی جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔ ایسا مہمان اگر غلطی سے صوفے پر بیٹھ جائے تو ان کی نگاہ ہر وقت اسی طرف رہتی ہے مہمان اگر دائیں طرف مڑا تو انکی نگاہ بھی دائیں طرف گھومی۔ مہمان بائیں جانب گھوما تو اسکی نگاہ بھی بائیں طرف مڑ گئی۔ صوفے نے ذرا بھی چوں کی تو میری بیوی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگتی ہیں۔ اس قسم کے حادثوں کے باعث انہیں آجکل اختلاج رہتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے مہمان کو اختلاج ہوتا ہے بعد میں میری بیوی کو ہوتا ہے اسی لئے اس وقت میں نے بھابی سے زیادہ بات نہیں کی اور چپ چاپ اپنا گھٹنا سہلاتا ہوا وہاں سے چلا گیا ورنہ یہ بہت ممکن تھا کہ اگر میں جواب دینے کی کوشش کرتا تو بھابی کو ہسٹریا کا دورہ پڑ جاتا۔ خیر کسطرح لال جی بھائی مول جی بھائی دھوکے والا کی بلڈنگ میں پہنچا تو معلوم ہوا یہاں کسی فلم کمپنی کا دفتر نہیں ہے۔ پہلی منزل پر باہر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

تیل دھارا

ایک خوشبو دار مرکب تیل جو ہر مرض کا شرطیہ علاج ہے۔ موجد ڈاکٹر ملک

میں پورڈ پڑھ کے جلدی سے آفس میں چلا گیا۔ آفس میں ایک بہت بڑی میز پر سر لٹکائے ملک صاحب یعنی کہ ڈاکٹر صاحب اونگھ رہے تھے۔ میں نے جاتے ہی ایک شعر ترنم سے پڑھا ہڑبڑا کے اُٹھ بیٹھے اور بڑی شفقت سے بغلگیر ہو کے کہنے لگے "میں لکھ پتی ہونے والا ہوں۔ مجھے مبارکباد دو۔" "وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔ ملک صاحب میری طرف دیکھ کے مسکرائے۔ دراصل ملک صاحب کے مزاج میں عاجزی کو بہت دخل ہے۔ وہ ہاتھ بڑھا بڑھا کے، انگلیاں نچا نچا

کے، جبڑہ ہلا ہلا کے بات نہیں کرتے، آنکھیں نیچی کئے، گردن جھکائے، کندھے سکوڑے بڑی عاجزی سے اسطرح گفتگو کرتے ہیں۔ گویا اپنی بیوی کے سامنے بول رہے ہوں۔ دراصل ایک شوہر کے مزاج کی تعمیر میں اس کی بیوی کے مزاج کا بہت بڑا دخل ہوتا ہے اور اگر نہ ہو تو شوہر کو ہر وقت بے دخل ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ اسلئے ملک صاحب نے قریب قریب سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ میں لکھ پتی ہونے والا ہوں تو انکی آواز میں ایسی لرزش تھی گویا وہ کسی گناہ کیلئے اپنی بیوی سے معافی مانگ رہے ہوں۔ میں نے کہا بھائی آخر بتاؤ ماجرا کیا ہے۔ تم تو ایک فلم کمپنی کھول رہے تھے یہ تیل دھارا کیا لے بیٹھے! ملک صاحب کہنے لگے۔ یہ شیشے کی الماریوں میں اسے دیکھ سکتے ہو۔ یہ میری ایجاد ہے۔ یہ خوشبودار تیل اس زمانے کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔ میری بیوی کے سوا۔۔۔۔ پھر کھانس کر آگے چلے۔ یہ تیل ماتھے پر لگالو تو سر درد دور ہو جاتا ہے ناک کے نتھنوں میں ڈالو تو زکام غائب ہو جاتا ہے۔ کان میں ڈالو تو کان کی میل صاف ہو جاتی ہے۔ یہ تیل بیک وقت بالصفا پوڈر بھی ہے اور بال اُگانے کا تیل بھی ہے۔ وہ کیسے؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ وہ بولے اس تیل کو دن میں لگاؤ تو بال صاف کر دیتا ہے، رات کو لگاؤ تو بال اُگاتا ہے۔ اسکے علاوہ یہ تیل سفید بالوں کو کالا کرتا ہے۔ اور کالے آدمیوں کو گورا کرتا ہے آپ اسے سر پر لگا سکتے ہیں اور ضرورت پڑے تو پی بھی سکتے ہیں کیونکہ اسمیں ارنڈی کا تیل بھی شامل ہے جو قبض کشا ہوتا ہے۔ اور انتڑیوں کو صاف کرتا ہے۔ گویا یہ تیل ہر مرض کا جواب ہے بہترین خضاب ہے اور خوشبودار جلاب ہے۔ اتنا کچھ کہہ چکنے کے بعد ملک صاحب پھر مجھ سے لپٹ گئے۔ میں نے بڑی محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا "اب تک کتنے لاکھ بوتلیں اس تیل کی بک چکی ہیں؟"

ابھی تک تو صرف تین بوتلیں بکی ہیں مگر دراصل پبلسٹی اور تم جانتے ہو آجکل کا زمانہ۔۔۔۔

ملک صاحب آگے کچھ کہنا چاہتے تھے مگر نہیں کہہ پائے کیونکہ محمود آگیا تھا۔ محمود ہم دونوں

کا دوست ہے۔ اور بہت ہی جذباتی آدمی ہے وہ حسین سیٹھ مرگھے والا کی دوکان پر کپڑا بیچتا ہے اور فرصت کے وقت فلمی کہانیاں لکھتا ہے جو ابھی تک کہیں فروخت نہیں ہو سکیں اس سے اُسکے جذباتی ہونے کا اندازہ لگ سکتا ہے آج وہ خلاف معمول بہت خوش نظر آتا تھا۔

میں نے پوچھا محمود پیارے کیا بات ہے۔ بہت خوش نظر آ رہے ہو، نوکری سے جواب مل گیا۔

وہ بولا۔ نہیں بھائی، نوکری سے جواب تو نہیں ملا۔ ایک ایسی ترکیب ذہن میں آئی ہے جس سے ہم سے تینوں لکھ پتی ہو سکتے ہیں۔ ملک صاحب نے پوچھا کتنے دنوں میں؟ دراصل محمود بھائی یہ سوال بہت اہم ہے کہ آدمی کتنے میں لکھ پتی ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر تم اس تیل دھارا کو لے لو۔ پچھلے تین ماہ میں، میں نے اس کی تین بوتلیں فروخت کی ہیں۔ اس رفتار سے مجھے یقین ہے کہ اگر میں سو سال اور زندہ رہ جاؤں تو ضرور لکھ پتی ہو سکتا ہوں۔

بیشک، بیشک محمود نے سر ہلا کے کہا مگر اس کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہوں ہر ایک کے دن پچاس ہزار

بالکل، بالکل، ملک صاحب نے مزید تائید فرماتے ہوئے اپنے کندھے سکوڑ کے اور اپنی ناک اونچی کر کے محمود کی طرف "تمسکانہ" دیکھا اور پھر پوچھا کتنے دن۔ کتنے دن لگیں گے۔ لکھ پتی بننے میں؟

کوئی ایک سال کا عرصہ چاہیئے۔

تو ایک سال تک کیا کریں گے، یہی تیل دھارا بیچیں گے؟

یے شک، بیشک محمود نے بے خیالی میں کہا اور پھر چونکتا ہو کے بولا۔ ایسا نہیں ہے ملک صاحب میری اس ترکیب سے پہلے سینکڑوں کی آمدنی ہو گی پھر ہزاروں کی، ایکسال کے بعد لاکھوں کی آمدنی ہونے لگے گی

"تو جلدی سے بتاؤ نا" ملک صاحب نے ذرا چڑ کے کہا۔ بتاتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ملک صاحب آپ ادبی ذوق رکھتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ حالات زمانہ نے آپ کو تیل دھارا بیچنے پر مجبور کر دیا ہے اور مجھے کپڑا بیچنے پر مگر ہم دونوں ادبی ذوق رکھتے ہیں اور یہ ہمارا دوست

(میری طرف اشارہ کرکے) تو شاعر ہیں۔ کیوں بھئی۔ کل کے مشاعرے سے تمہیں کیا ملا۔؟

"آنے جانے کا تھرڈ کلاس کا کرایہ اور دس روپے نقد سوڈا لیمن وغیرہ" اچھے رہے ملک صاحب نے خوش ہو کر میری طرف دیکھا۔

بیشک بیشک، محمود کی نگاہوں نے ——— تقریباً اپنا ہاتھ میری جیب میں ڈال لیا۔

ملک صاحب نے کہا۔ "تو وہ ترکیب بتاؤ نا جلدی سے۔" محمود کچھ کہنے کو تھا کہ تیل دھارا کے آفس میں گردھاری داخل ہوا۔ گردھاری ہم تینوں دوستوں کا چوتھا دوست تھا۔ مگر اسوقت وہ ایک دشمن کیطرح بپھرا ہوا نظر آرہا تھا اسکی قمیض گندی اور میلی تھی۔ گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں۔ ماتھے پر اُلجھی سُلجھی شکنیں اور پاؤں دھول میں اٹے ہوئے تھے۔ بہر حال ہم نے اسکے غصّے کے باوجود اسے اپنی نئی ترکیب میں شامل کیا۔ محمود کی ترکیب جسے لاکھ پتی بننے کی ترکیب بہت آسان معلوم ہوتی ہے۔ ہم سب لوگ ایک فلمی کہانی لکھیں گے اور پھر مل کر بیچیں گے اور پیسے آپس میں بانٹ لیں گے یہ ایک کہانی سنڈیکیٹ ہوگا۔ جہاں پروڈیوسروں کو ہر طرح کی، ہر قماش کی اور ہر مزاج کی کہانیاں دستیاب ہو سکیں گی۔ کہانی جسمیں ہیرو ہیروئن کو بھگا لے جاتا ہے، اور کہانی جسمیں ہیروئن ہیرو کو بھگا لیجاتی ہے یا وہ کہانی جسمیں ویلن دونوں کو بھگا لے جاتا ہے، ہر طرح کا فارمولا استعمال کیا جائے گا بالکل تیل دھارا کا فارمولا ہوتا ہے۔

"بیشک، بیشک۔" محمود نے سر ہلا کر کہا۔ گردھاری نے میز پر زور سے مکہ مار کے کہا مگر یہ سکیم چل سکتی ہے ہم اس سے لاکھوں روپے کما سکتے ہیں ہمارے پاس کیا نہیں ہے۔ عقل ہے تہذیب ہے، ہنر ہے، انکسار ہے۔ اور تیل دھارا ہے۔

بیشک، بیشک۔

گردھاری نے میز پر زور سے دوسرا مکہ مار کے کہا۔ "محمود تم ہر وقت بیشک بیشک نہ کہا کرو مجھے سخت غصّہ آتا ہے۔ اسوقت ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم لوگ متحد ہو جائیں اور متحد ہو کر

دنیا میں کام کریں۔ جبتک دنیا میں ہم اپنا گروپ نہیں بنائیں گے۔ ہمیں کوئی نہیں مانے گا۔ عباس کو دیکھو اپنا گروپ بنا کے کام کرنے لگا آج لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ کس لئے صرف اسلئے کہ اسکا اپنا گروپ تھا۔ تم عباس سے کم لائق ہو۔

محمود۔ تم ملک میں گردھاری "اتم نادم" تم کتنے بڑے شاعر ہو کون تمہیں پوچھتا ہے سارے میاں دنیا میں گروپ بنا کے کام کرو۔ یہ سالا عباس، میں اسے ٹھیک کر دوں گا۔ میں اسے بتا دونگا۔ میں تم کو محمود، تم اُسکے خلاف گروپ کا لیڈر بناؤں گا۔ دنیا دیکھیگی اور عباس یاد کریگا کوئی اُسکے سامنے چھاتی تان کے کھڑا ہوا تھا۔ میں اسے نیچا دکھاؤں گا وہ میرے پاؤں پڑیگا۔ گڑگڑائے گا، روئے گا لیکن میں اسے معاف نہیں کرونگا۔ سالا کیا سمجھتا ہے اپنے آپ کو؟ میں اسے وہ ذلیل کرونگا وہ ذلیل کرونگا...

محمود نے پوچھا۔ کیا بات ہے۔ عباس نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ تم نہیں جانتے گردھاری نے انتہائی خفا ہو کے کہا۔ "عباس کا نام مت لو میرے سامنے۔

میں نے کہا ہم کہاں لے رہے ہیں۔ تم خود ہی اس کا ذکر کر رہے ہو اور میں سن رہا ہوں حالانکہ وہ میرا دوست ہے

ملک صاحب نے بات کا پہلو بدل کے محمود کی سکیم کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا اسمیں شاخسانے نکالے۔ یہ طے کیا گیا کہ کہانیاں بیچنے کیساتھ ساتھ تیل دھارا بھی بیچی جائے اسکے علاوہ محمود حمد وہابی حسین سیٹھ مرگھے والا کی دکان پر کپڑا بھی بیچتے رہیں۔ گردھاری جو چھ ماہ سے بیکار تھا بدستور نوکری کی تلاش کرتا ہے اور دفتروں کے چکر لگاتا رہے اس دوران اگر کوئی مشاعرے کے لئے مجھے دعوت دیدے تو میں یہ کوشش کروں کہ اپنے تینوں دوستوں کو اس میں مدعو کروں۔ نظمیں سب کیلئے خود لکھوں تخلص بدل بدل کے۔ بغرضیکہ ایک اچھی خاصی سکیم تیار ہو گئی۔ اسی گفتگو میں ڈھائی بج گئے اور تین بجنے کو آگئے۔ میں چاہتا تھا کہ محمود گھر چلا جائے اور گردھاری بھی چلا جائے تو میں ملک صاحب کو کسی ہوٹل میں کھانے کیلئے مدعو کر دوں کیونکہ میری جیب بہت زیادہ بھاری نہ تھی۔ مگر یہ نہ ہوا۔ کسی نہ کسی طرح بات سے بات نکلتی ہی رہی

گفتگو چلتی رہی۔ گردھاری کے ہونٹوں پر پپڑیاں سوکھتی رہیں۔ محمود ایک مجبور کھلونے کیطرح گردن ہلا ہلا کے بیشک بیشک کہتا رہا اور ملک صاحب کے شانے سکڑتے لگے اور ان کی اندر رہتی ہوئی آنکھوں پر سیاہ پپوٹے، سڑے ہوئے پانی پر سیاہ کائی کی طرح پھیلتے گئے۔ جب ساڑھے تین ہونے کو آئے تو میں نے ملک صاحب سے کہا۔ اوہ۔ باتوں باتوں میں کھانا تو بالکل ہی بھول گئے چلئے کسی ہوٹل میں چل کے کھالیں۔ محمود اور گردھاری بھی فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے ملک صاحب نے کہا، بھائی نادم میں بہت نادم ہوں مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔" چلیئے نا ملک صاحب" محمود بولا "آپ نادم کہہ رہے ہیں تو آپ انکار کیسے کر سکتے ہیں۔ ایسے تو مجھے بھی بھوک نہیں ہے" گردھاری نے کہا، میں تو کھا کے آیا ہوں۔

تھوڑا سا چکھ لینا، دو چار لقمے۔

نہیں نہیں۔ گردھاری بڑے غصے میں بولا۔ میں کھا کے آیا ہوں۔

میں نے اسکی بانہہ میں اپنی بانہہ ڈال دی اور اسے اپنے ساتھ گھسیٹ کے لے آیا۔

پہلے میرا ارادہ ایک درمیانی درجے کے ہوٹل میں جانے کا تھا۔ مگر پہلے میرا ارادہ صرف ملک صاحب کو ساتھ لیجانے کا تھا۔ پہلے دو آدمی ہوتے اب چار تھے۔ اس لئے میں نے اپنا ارادہ بدل گیا اور ایک سستے سے ہوٹل میں گھس گیا یہ بھیاجی کا ہوٹل تھا یہاں کھانے میں صرف پوری بھاجی ملتی ہے۔ تیل کی پوری آلو کی بھاجی نل کا پانی سب ملا کے چھ آنے میں ایک آدمی کا کھانا ہوتا ہے مگر آج چونکہ ملک صاحب کو بھوک نہیں تھی اس لئے انہوں نے صرف دس پوریاں کھائیں، محمود نے بارہ، میں نے پندرہ اور گردھاری تو گھر سے کھا کے آیا تھا اُسکے لئے پچیس پوریاں منگائی گئیں۔ اسکے علاوہ اُسکے لئے دہی بڑے کی بڑی پلیٹوں کا آرڈر بھی دیا گیا جب کھانا ختم ہوا تو میرے مشاعرے کی بقیہ رقم بھی ختم ہو چکی تھی۔ میری جیب میں

صرف پانچ آنے کے پیسے رہ گئے تھے۔ جب ہوٹل سے نکلے تو محمد کو ایک ضروری کام یاد آگیا اور ملک صاحب کو تیل وھارا کی ایک شیشی بیچنے کیلئے کہیں جانا تھا خیر وہ دونوں تو چلے گئے اور ہم دونوں نکھ پتیوں کو اکیلا چھوڑ گئے۔

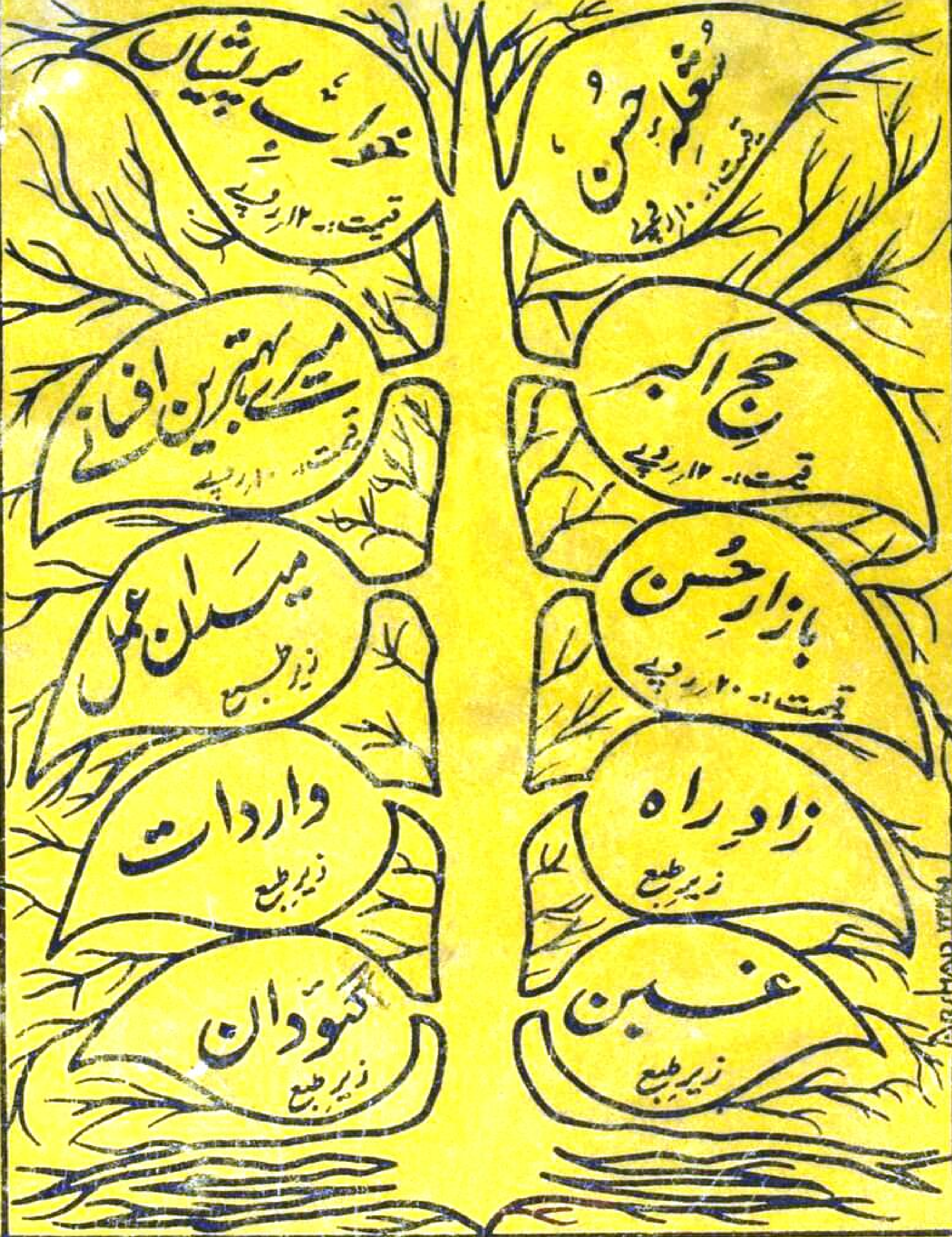
گردھاری نے مجھ سے کہا۔ جانتے ہو۔ میں نے آج تین دن کے بعد کھانا کھایا ہے
میں نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آہستہ سے کہا۔ کافی پیو گے۔
گردھاری نے کہا۔ کیوں نہیں پیئیں گے؟
تو چلو سامنے کی دکان میں۔ یہ اس دوکان کا مالک ایرانی میرا واقف ہے۔

ایرانی کی دکان کے اندر پہنچکر گردھاری نے اپنے دھول میں اٹے ہوئے پاؤں دھوئے اپنا چپل دھویا۔ جس کے تلے کے اندر ایک بہت بڑا سوراخ تھا اور اس نے اپنا منہ دھویا پھر اس نے اپنے بالوں کی کنگھی کی اور میرے ساتھ ایک کیبن میں آبیٹھا۔ لوائے نے گرم گرم کافی کے دو کپ، ہمارے سامنے لا کے رکھے۔

گردھاری نے کپ اٹھایا۔ کافی کی سوندھی سوندھی مہک اور پیالی سے اُٹھتی ہوئی دھوئیں کی لکیریں بل کھاتی ہوئی پھیلتی ہوئی فضا میں گم ہوتی گئیں۔ گردھاری کا چہرہ صاف ہو گیا۔ ماتھے کی ہر شکن دور ہوتی گئی۔ گردن کی تنی ہوئی رگیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ ہونٹوں کی پیڑیاں غائب ہوتی گئیں اور اسکی آنکھوں کی تپلیاں کسی مہربان خواب کے سایوں میں کھو گئیں۔

میں نے کہا۔ اچھا اب بتاؤ تمہیں عباس سے نفرت کیوں ہے؟ گردھاری نے بڑے نرم ملائم لہجے میں آہستہ سے کہا۔ نفرت۔ مجھے عباس سے نفرت نہیں ہے آج میں بھوکا نہیں ہوں۔

گردھاری کے چہرے کو دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ہوا مشرق سے آرہی ہے جیسے خوشبو چاروں طرف پھا رہی ہے جیسے بنجر اور ویران کھیتوں میں گندم کے لاکھوں پودے اُگ رہے ہیں۔


شعلۂ حسن
قیمت ۱۰ روپے
تحفۂ پریشاں
قیمت ۱۲ روپے
حجِ اکبر
قیمت ۱۲ روپے
میرے بہترین افسانے
قیمت ۱۰ روپے
بازارِ حسن
قیمت ۲۰ روپے
میدانِ عمل
زیرِ طبع
زادِ راہ
زیرِ طبع
واردات
زیرِ طبع
غبن
زیرِ طبع
گئودان
زیرِ طبع
ARSHAD YEHIA